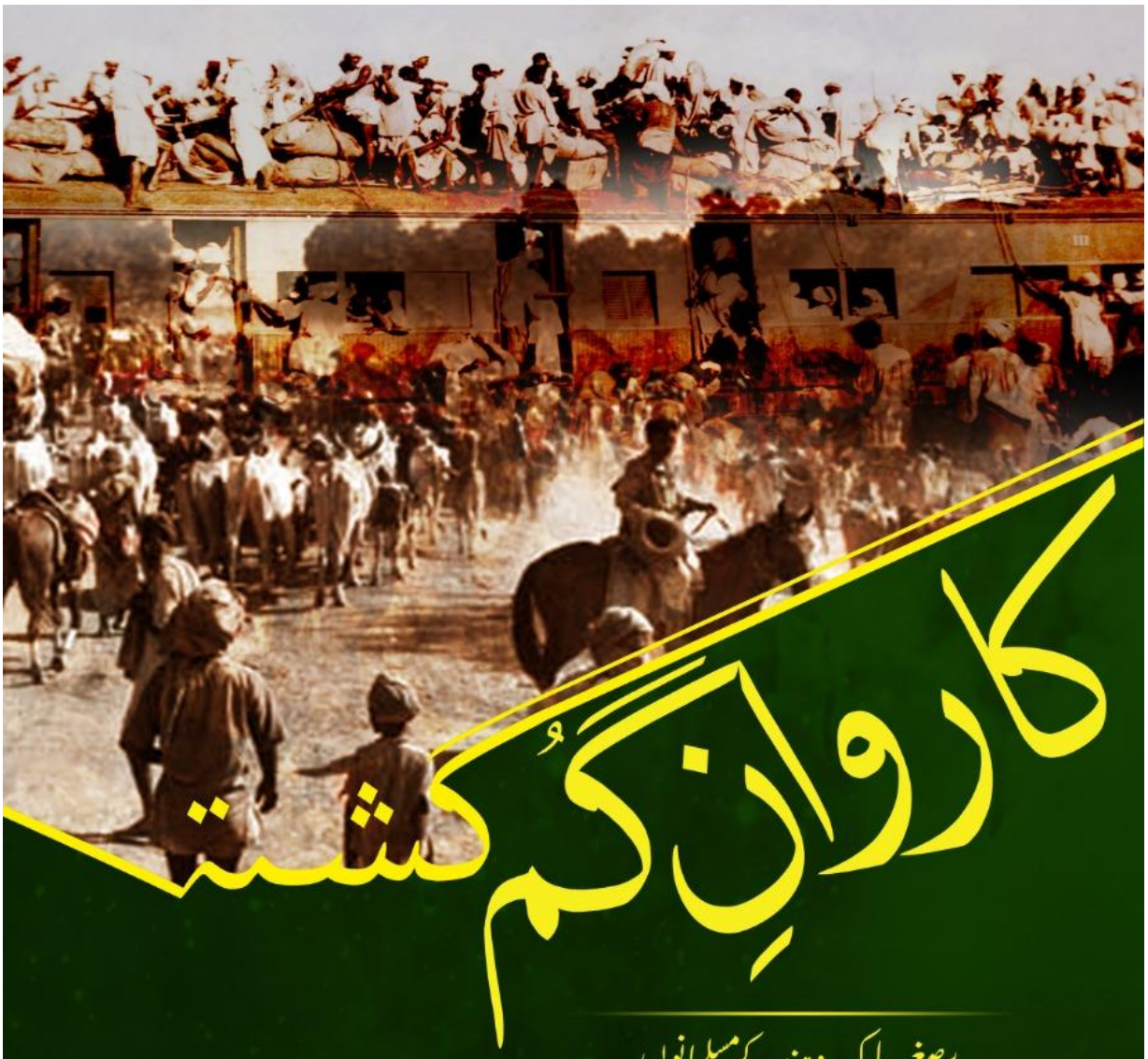

کاروانِ گم گشتہ

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں
کی جد و جہدِ آزادی کی داستان

از

سید رئیس احمد جعفری ندوی

سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی

کاروانِ گم گشتہ

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی
جدوجہدِ آزادی کی داستان

از

سید رئیس احمد جعفری، ندوی مرحوم
(صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی)

سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی
کراچی

کانپور بھیجا اور ان کے ساتھ ہر صوبے کے ممتاز وکیلوں اور بیرسٹروں کا کانپور پہنچ جانا ان ہی کی تحریک کا فیض تھا۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ تحریر اور اس شاندار انداز میں مولانا ابوالکلام کے خدمات کا اعتراف جہاں ایک ناقابل تردید حقیقت ہے وہاں ان کی عالی ظرفی کی دلیل بھی ہے۔

مسلمان چاہتے تھے کہ کانپور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر بٹلر کو سزا دی جائے۔ مسجد از سر نو بنوائی جائے۔ قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور شہداء کا خوں بہا ادا کیا جائے۔ مگر مسٹن صاحب کی فرعونیت ان مطالبات کو مدخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ وہ مسٹر بٹلر کے فیصلے میں معمولی سی ترمیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔

حکومت کی ایک چال

یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی ہند کے مشہور ماہر آئین و قانون سر سید علی امام وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کے ممبر تھے انھوں نے مولانا محمد علی اور ان کے ذریعے سے مولانا عبدالباری فرنگی کو پیام صلح بھیجا۔ حکومت ہند نے صوبائی حکومت سے قطع نظر کر کے بطور خود اس مسئلے کا فیصلہ یوں کرنا چاہا تھا کہ :-

- قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔
- زیر سماعت ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔
- مظلوموں کی مالی مدد کی جائے گی لیکن
- مسجد کا جو حصہ منہدم کیا جا چکا ہے، وہ علی حالہٖ رہے گا۔
- مسلمان از سر نو تعمیر کا مطالبہ نہ کریں۔

یہ شرائط حد درجہ نامعقول تھے، نہ مولانا محمد علی نے انھیں منظور کیا نہ اسلامی ہند کے مشہور پیر طریقت اور عالم دین مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی دینی حمیت اسے قبول کر سکتی تھی، سر علی محمد خاں راجہ (بعد میں مہاراجہ) محمود آباد، یوپی کے سب سے بڑے مسلمان تعلقہ دار تھے، لیکن اس واقعے سے وہ اتنے متاثر تھے کہ نہ انھیں اپنے تعلقے کی ضبطی کی پروا تھی نہ جیل جانے کی، علی الاعلان اور کھلم کھلا

اشاعت اوّل۔ ۱۹۷۱ء

جملہ حقوق بحق بیگم آفتاب رئیس احمد جعفری محفوظ

مطبوعہ بہ انجمن پریس نشتر روڈ کراچی ۳

وہ مسلمانوں کے مطالبات کی نہ صرف تائید و حمایت کر رہے تھے، بلکہ اس تحریک کے زعیم کبیر کی حیثیت بھی اختیار کر چکے تھے، مسلمانوں نے متفقہ طور پر حکومتِ ہند کے یہ ٹرا لُعا مسترد کر دیئے۔ ہمدرد اور الہلال نے ان کے خلاف سخت اور درشت لہجے میں اداریے لکھے، مسٹر جیمس سٹن کا کہنا یہ تھا کہ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی حکومت ہند بھی معمولی ترمیم کے ساتھ یہی کہہ رہی تھی۔ اور مسلمان کہہ رہے تھے کہ اگر تقسیم بنگال کا "طے شدہ" اور ناقابل تنسیخ فیصلہ بدلا جا سکتا ہے تو اس معمولی ڈپٹی کمشنر کا حد درجہ غیر دانشمندانہ اور اشتعال انگیز فیصلہ کیوں نہیں بدلا جا سکتا۔

علامہ شبلی کی معرکۃ آلارا نظم حکومت ہند کے شر انگیز پر شعراء نے طبع آزمائیاں بھی کیں، مولانا شبلی کی نظم اسی سلسلے میں الہلال میں شائع ہوئی جو زبان و بیان کے علاوہ فرائض کے اعتبار سے بھی بڑی اہم ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح — یہ اگر سچ ہے تو جز خوبی تقدیر نہیں
لیکن انعامِ گراں قدر و وظائف کی طمع — یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے — دیتِ قتل شہیدانِ جواں میر نہیں
داد خواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا — ورنہ ان کو گلۂ سختیٔ تقدیر نہیں
آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی — یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں!
آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ — حاملِ فقہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں
اور ہی کچھ ہے گرفتاریٔ دل کی ترکیب — سختیٔ طوق و گراں باریٔ زنجیر نہیں

مسلمانوں کی فتح برطانوی حکومت کا یہ شعار تھا کہ کمزور کو دباتی اور زور آور سے دبتی تھی۔ بنگال کی تقسیم اس لیے منسوخ ہوئی کہ ہندوؤں نے ڈٹ کر برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا تھا اور خون کی ہولی کھیلنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا اور جب ان کی مزاحمت برطانیہ کے لیے ناقابلِ دفاع بن گئی تو اس نے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے جو کمزور تھے ان کا مطالبہ مان لیا، تقسیم منسوخ کر دی۔ یہ حقیقت مسلمانوں کے سامنے تھی لیکن یہ معاملہ صرف قومی نہیں مذہبی تھا، وہ مرنے اور مٹ جانے پر تیار ہو گئے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے تمام طبقات اور

فہرست

پیش لفظ		بیگم آفتاب رئیس احمد جعفری	۳
افتتاحیہ		حکیم محمد سعید دہلوی	۵
تحریک پاکستان سے قبل کی مسلم قیادت	۹	پنجاب کے چند اکابر	۴۶
مولانا حسرت موہانی	۱۲	سندھ کے چند اکابر	۴۷
مولانا محمد علی جوہر	۱۶	اکابر سرحد	۴۸
شعیب قریشی	۲۷	صوبہ متحدہ کے چند اکابر	۴۹
رؤف بے	۲۹	بمبئی کے چند اکابر	//
مولانا شوکت علی	۳۱	نواب حمید اللہ خاں	۵۱
چند دیگر مسلمان اکابر و مشاہیر	۳۸	نواب بہادر یار جنگ	//
مولانا ابوالکلام آزاد	//	بہار اور سی پی کے چند اکابر	۵۳
ڈاکٹر سیف الدین کچلو	۳۹	چند ہندو اکابر کا تذکرہ	۵۳
مولانا ظفر علی خاں	۴۰	مہاتما گاندھی	//
آصف علی	۴۲	موتی لال نہرو	۵۹
ڈاکٹر سید محمود	۴۳	جواہر لال نہرو	۶۱
فضل الحق	۴۴	سر تیج بہادر سپرو	۶۲
خواجہ ناظم الدین	//	چند دیگر ہندو رہنما	۶۳
حسین شہید سہروردی	۴۵	۱۸۵۷ء سے قبل	۶۷
اصفہانی	۴۶	۱۸۵۷ء کی بغاوت۔ اسباب و نتائج	۸۰

سرسیّد احمد خاں ۹۶
سرسیّد کی رہنمائی ۹۸
راہ کی مشکلات ۹۹
سرسید کا اخلاص اور بے لوثی ۱۰۱
ہندو مسلم ہم آہنگی کی خواہش ۱۰۳
سرسید کی عالی ظرفی اور بے تعصبی ۱۰۴
ہندوؤں کی اُردو دشمنی ۱۰۵
ہندوؤں سے سرسید کی مایوسی ۱۰۶
سرسید کی سیاسی جدوجہد ۱۰۸
سرسیّد کی پالیسی ۱۱۲
مسلمانوں کی بے حسی ″
سرسید کی رواداری ۱۱۳
ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کی اہمیت ۱۱۴
ہندوؤں کا سیاسی لائحہ عمل ۱۱۵
ہندوؤں کی چند نیم سیاسی مذہبی انجمنیں ۱۱۶
مسلمان اور کانگریس ۱۲۱
کانگریس کے خلاف سرسید کا جہاد ۱۲۲
کانگریس کی ایک خاص تکنیک ۱۲۴
انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا پس منظر اور دستاویزی تاریخ ۱۲۶
بدرالدین طیب جی ۱۲۷
رحمت اللہ سیانی ۱۲۸
کانگریس کا قیام اور انگریز
مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن کی ملاقات ۱۲۹
نتائج فکر ۱۳۰
ایک اعتراض اور اس کا جواب ۱۳۳
کانگریس کی شان عبودیت ۱۳۴
انجمن محبان وطن کا قیام ۱۳۷
سرسیّد کے خلاف محاذ ۱۳۸
ہندوستان کی قومیت متحدہ اور انگریز ۱۴۰
مسلمان بادشاہوں کی رواداری ″
برصغیر میں انگریزوں کی پالیسی ۱۴۱
مسلمانوں کے اوقاف کا مصرف ۱۴۳
پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت ۱۴۵
اردو کے خلاف حکومت کا قدم ۱۴۷
اردو کا مقدمہ اور محسن الملک کی رہنمائی ۱۴۹
لکھنؤ کا جلسہ اور گورنر کی برہمی ۱۵۰
محسن الملک کی معرکہ آرا تقریر ۱۵۱
محسن الملک پر عتاب ۱۵۲
محسن الملک کا استعفاء ۱۵۳
خلاصۂ مباحث ۱۵۵
نواب وقار الملک

انگریز اور ہندوؤں کی دل جوئی ۱۵۷
وقار الملک میدان عمل میں ۱۶۵
محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کا قیام ۱۶۶
کانگریس کی شعلہ نوائی ۱۶۷
سیاست ملی کا عہد آفریں دور ۱۷۳
کانگریس کا رویہ ۱۷۵
سنہری کاٹن 〃
بنگال کی تقسیم ۱۷۷
ہندو مسلم اتحاد کی مخلصانہ کوشش ۱۸۷
مسلم لیگ کا قیام اور اس کا پس منظر ۱۹۲
ہندوستان میں سیاسی اصلاحات 〃
مسلمانوں کی نئی نسل اور سیاسی بیداری ۱۹۴
حکومت خود اختیاری کا مطالبہ ۱۹۵
بمبئی گزٹ کا تبصرہ ۱۹۷
وفد شملہ ۱۹۸
وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس ۱۹۹
ایڈریس کا جواب 〃
وفد شملہ کا رد عمل ۲۰۰
مسلم لیگ کا قیام ۲۰۲
قیام مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ۲۰۴
چند تجاویز ۲۰۴
کانگریس اور مسلم لیگ کی سرگرمیاں
عوامل و محرکات ۲۰۸
کانگریس کی سرگرمیوں پر ایک نظر ۲۰۹
مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر ایک نظر ۲۱۴
تقسیم بنگال کی منسوخی اور مسلم ہند کا رد عمل ۲۱۸
مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی ۲۲۳
گانگریس سے مسلم لیگ کی مایوسی اور عزم عمل ۲۲۵
آغا خاں کی صدر کانگریس سے ملاقات 〃
صلح کانفرنس ۲۲۶
کانفرنس کی ناکامی کے اسباب ۲۲۷
نواب وقار الملک کے خون کے آنسو ۲۳۲
عزیز مرزا کا گشتی مراسلہ ۲۳۶
مسلم لیگ کا ایک انقلابی قدم ۲۳۸
کانگریس کی ایک پرانی روش ۲۳۹
مسلمانان ہند اور عالم اسلامی ۲۴۲
ایران کی داستان مظلومیت ۲۴۴
مسلمانان ہند کا ایک خاص امتیاز ۲۴۶
انجمن خدام کعبہ کا قیام ۲۴۷
ترکوں کی مالی امداد ۲۴۹
برطانوی پریس کی گھبراہٹ ۲۵۵

اقبال اور ان کا عہد ۲۵۸
ایک نئے دور کی ابتدا ۲۵۹
طرابلس پر اٹلی کا حملہ ۲۶۰
اقبال ۔ نئے دور کا نقیب ۲۶۱
اقبال کے خیالات میں تبدیلی ۲۶۲
بلقان کے خلاف مغرب کی سازش ۲۶۷
ترک اور ملتِ اسلامیۂ ہند ۲۶۹
مسلمانوں کی بیداری اور مسلم صحافت ۲۷۰
ملی بیداری میں اقبال کی شاعری کا حصہ ۲۷۲
اقبال کے خیالات میں تبدیلی کا پس منظر ۲۷۸
اقبال کی شاعری کا پیام ۲۹۰
علامہ شبلی کی شعلہ نوائیاں ۳۰۵
علامہ شبلی نعمانی ۳۰۶
علی گڑھ کالج کے طلبا میں بیداری ۳۱۱
گورنر یوپی کی علی گڑھ کے طلبا کو نصیحت ۳۱۲
میڈیکل مشن اور ڈاکٹر انصاری ۳۱۳
ڈاکٹر انصاری سے علامہ شبلی کی عقیدت ۳۱۵
علامہ شبلی کا ایک فتویٰ ۳۱۶
یونی ورسٹی کا قیام اور حکومت کی شرائط ۳۱۸
ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور میڈیکل مشن کی خدمات ۳۲۰
ایسکوتیھ اور گرے کی اشتعال انگیزی ۳۲۰
کامریڈ کا لاجواب تبصرہ ۳۲۱
ہمدرد کا ایک دل گداز مضمون ۳۲۴
ترکیہ کے حالات ۳۲۶
مسلم بینک اور کوآپریٹو سوسائٹی ″
ترکوں کی آبادکاری ۳۲۷
میڈیکل مشن کی عظیم الشان خدمات ۳۲۸
چند مزید تفصیلات ۳۳۰
نواب وقار الملک کا ایک اہم مکتوب ۳۳۳
میڈیکل مشن کی واپسی ۳۳۷
عظیم الشان استقبال ″
علامہ شبلی کی روح پرور نظم ۳۳۸
مولانا ظفر علی خاں اور ان کی ملی شاعری ۳۴۵
نئی نسل اور ملی شعور کی بیداری ۳۵۴
زمیندار کا شاندار کارنامہ ۳۵۵
ملت اسلامیہ کی بیداری میں ابوالکلام کا حصہ ۳۵۷
مولانا حسرت موہانی کی مجاہدانہ زندگی ۳۶۹
مجموعہ اوصاف ″
سامراج دشمن ۳۷۱
شبلی کی تحسین ۳۷۲
اردوئے معلی پریس سے ضیافت طلبی ۳۷۳

الہلال کا شذرہ ۳۷۳
مشاہدات زنداں ۳۷۵
بیگم حسرت موہانی کا حیرت انگیز کردار ۳۷۶
ایک یادگار واقعہ ۳۷۷
جیل کی زندگی ۳۷۹
الٰہ آباد جیل میں تبدیلی 〃
نینی جیل کے مشاہدات ۳۸۱
جیل میں رمضان ۳۸۲
سنٹرل نینی جیل کے چند اور مشاہدات ۳۸۴
مشاہدات زنداں کا ایک اور صفحہ ۳۸۷
جیل کے لرزہ خیز واقعات 〃
حسرت کی حیات زنداں کا ایک اور ورق ۳۸۹
کتب خانے کی بربادی ۳۹۱
حسرت کی زندانی شاعری پر ایک نظر ۳۹۶
مسجد کانپور کا المیہ ۴۰۹
حکومت کی ایک چال ۴۱۲
علامہ شبلی کی معرکۃ الآرا نظم ۴۱۳
مسلمانوں کی فتح 〃
علامہ شبلی کی نظم شکریہ ۴۱۴
کشتگان معرکۂ کانپور ۴۱۵
حکومت کے عزائم ۴۱۷
ہمدرد کا مقالہ افتتاحیہ 〃
گورنر یوپی کے نام مولانا محمد علی کا خط ۴۲۱
گورنر کا جواب ۴۲۲
خواجہ حسن نظامی کی تقریر ۴۲۳
مسجد کانپور کا المیہ ۴۲۶
حکومت کی غلط فہمی 〃
حکومت کا پروپیگنڈا اور حکومت کا جواب ۴۲۷
گورنر یوپی کی تقریر پر ہمدرد کا تبصرہ ۴۲۹
گورنر یوپی کی خدمت میں وفد اور میمورنڈم ۴۳۰
ارکان وفد ۴۳۲
وفد کی کارروائی کا خلاصہ ۴۳۳
وفد کو گورنر یوپی کا جواب ۴۳۴
علامہ شبلی کی ایک نظم ۴۳۹
حادثۂ کانپور - چند مزید گوشے ۴۴۰
قیدیوں اور زخمیوں کی حالت ۴۴۱
ڈاکٹر عبدالصمد کانپوری ۴۴۵
مولانا آزاد سبحانی 〃
حادثۂ کانپور اور عافیت پسند ۴۴۸
سر رضا علی کی ایک تقریر ۴۵۰
کیفی چریا کوٹی کا ایک قطعہ ۴۵۲

آزاد انصاری کا ایک قطعہ ۴۵۲
محاذ بنانے کی کوشش 〃
حکومت کی حمایت میں ایک جلسہ ۴۵۳
وزیر حسن ۴۵۴
سر رضا علی 〃
نواب رام پور ۴۵۵
حادثہ کانپور اور عافیت پسند ۴۵۶
نواب رام پور 〃
پر اسرار جلسے کی روداد ۴۵۷
اظہر علی ۴۶۱
سر محمد شفیع 〃
آک بی 〃
سر محمد یعقوب ۴۶۲
منشی عبد العزیز 〃
مولوی انشاء اللہ خاں 〃
حادثہ کانپور ۔ مصالحت ۴۶۴
وائسرائے کی تقریر اور مسئلے کا حل ۴۶۶
قیدیوں کی رہائی ۴۶۷
مولانا عبد الباری کا بیان 〃
حکومت اور مسلمانوں میں مصالحت ۴۷۰
چند شخصیات 〃

وائسرائے ۴۷۰
سر علی امام 〃
جان بیلی ۴۷۱
ناظر الدین حسن 〃
مسٹر ولیم 〃
مسٹر تسلیم ۴۷۲
راس مسعود 〃
ظہور احمد 〃
خواجہ عبد المجید 〃
سید محمود 〃
منٹو مارلے اصلاحات — پس منظر اور رد عمل ۴۷۳
سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات ۴۷۵
سنہ ۱۹۱۲ء کی اصلاحات ۴۷۷
اصلاحات کی خصوصیت ۴۷۹
اصلاحات کا اندرونی پس منظر ۴۸۰
بنگال کی تقسیم اور ہندوؤں کی شورش ۴۸۲
مسٹر گوکھلے ۴۸۳
مسلمانوں سے حکومت کا غیر منصفانہ رویہ ۴۸۸
مسلمان انقلاب پسند ۴۹۱
پہلا گروہ ۴۹۲

دوسرا گروہ	۴۹۳
پہلی جنگ عظیم اور ترک	۴۹۴
مسلم زعما کا نقطہ نظر	۴۹۵
علی برادران کی نظربندی	//
مسلح انقلاب پسند مسلمان	//
مسلمان انقلاب پسند اور سر سڈنی رولٹ تحقیقاتی رپورٹ	۴۹۶
ریشمی رومال کی سازش	۴۹۸
مولانا عبیداللہ سندھی	۴۹۹
دارالعلوم دیوبند سے اخراج	//
شیخ الہند کی حجاز کو روانگی	//
افغانستان میں مولانا عبیداللہ کی مساعی	۵۰۰
مولانا عبیداللہ کا منصوبہ	//
مولانا عبیداللہ کی ذہانت کا اعتراف	۵۰۱
برکت اللہ بھوپالی	۵۰۲
زار روس کے نام خط	۵۰۳
ریشمی رومال کی سازش	۵۰۴
خدائی فوج کا قیام	//
جہان اسلام، قسطنطنیہ	۵۰۷
رنگون میں انقلابی سرگرمیاں	//
بلوچ رجمنٹ کی بغاوت	//
ملایا کی ہندوستانی فوج کی بغاوت	۵۰۷
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی	۵۰۹
شیخ الہند کی گرفتاری	//
سفرنامہ شیخ الہند	۵۱۰
سعید و مضطرب روح	۵۱۱
سفر حجاز	۵۱۲
شیخ الہند حجاز میں	//
گورنر مدینہ منورہ کی بدظنی	۵۱۳
ترکی زعما کی مدینہ منورہ میں آمد	//
ایک قابل دید جلوس	۵۱۴
روضۂ نبوی کا انتظام	۵۱۵
شیخ الہندؒ کی گرفتاری	۵۱۶
اہل مدینہ سے ترکوں کا حسن سلوک	۵۱۷
شریف حسین کی بغاوت	//
ترکوں کے خلاف کفر کا فتویٰ	۵۱۸
شیخ الہندؒ کا فتوے کی تصویب سے انکار	۵۱۹
حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری	۵۲۰
حجاز سے روانگی	۵۲۲
زندان جیزہ سے محبس مالٹا تک	۵۲۳
جیزہ کے زندان سیاہ میں تفتیش	//
جیل کی زندگی	۵۲۶

مالٹا کو روانگی	۵۲۷
ترک قیدی	"
اہتمام روانگی	۵۲۸
مالٹا کے قلعے میں داخلہ	۵۲۹
شیخ الہند کا جذبۂ ایثار	۵۳۰
زندانی دارالعلوم	۵۳۱
مالٹا میں مسٹر برن کی آمد اور ان کا مشن، شیخ الہند کے رفقاء سے ملاقاتیں	۵۳۲
سحر خیزی اور تہجد گزاری	۵۳۳
مسٹر برن کی آمد	"
ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟	۵۳۴
قیدیوں کے ساتھ ترکوں کا حسن سلوک	۵۳۶
برن مشن کی ناکامی	۵۳۸
مولانا عزیر گل سے سوال و جواب	"
حکیم نصرت حسین کو رہائی کی پیش کش	۵۳۹
شیخ الہند سے آخری ملاقات	۵۴۰
مسٹر برن کی خصوصی ہدایت	"
حکیم نصرت حسین کی بیماری	"
ہسپتال میں داخلہ	۵۴۱
ہسپتال میں خصوصی توجہ	"
انتقال پُرملال	۵۴۲
میت کو تیمم کرایا گیا	۵۴۳
اسیروں کی رہائی کا آغاز	"
مالٹا سے روانگی	۵۴۴
اسکندریہ میں آمد	"
ہندوستان واپسی اور رہائی	"

پیش لفظ

یہ دوسری کتاب بھی رئیس احمد جعفری اکیڈمی شائع کر رہی ہے۔ اس سے پہلے کی کتاب میری خواہش کا نتیجہ تھی اور موجودہ کتاب خود جعفری صاحب کی خواہش کی تکمیل میں شائع کی جا رہی ہے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ کاش جعفری صاحب خود اپنی اس خواہش کی تکمیل کرتے بجائے میرے وہ خود اپنی اس تصنیف کی اشاعت کا انتظام کرتے۔ وہ کس قدر خوش نصیب تھے، زندگی میں بھی انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کی تمنا تھی اور اب بھی ان کی خوشی کے لیے دوسرے اپنے غم بھول کر بھی وہ کام کر رہے ہیں جو ان کو اور بھی زیادہ غم زدہ کر دیتا ہے۔

یہ خوشیاں کس قدر ظالم ہوتی ہیں یہ اپنی قیمت وصول کرنے کے لیے دل تو دل ہے روح کو بھی خاک کر دیتی ہیں۔

میں بھی کیا کر سکتی تھی اگر جعفری صاحب کے یہ مخلص اور عظیم دوست میرا ہاتھ نہ دیتے جن میں جسٹس سردار اقبال صاحب، جناب ممتاز حسن صاحب جسٹس ایس اے رحمان صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب اور جمیل الدین عالی صاحب بہت زیادہ پیش پیش ہیں۔ میں ان سب صاحبان کی تہہ دل سے ممنون اور احسان مند

ہوں۔ یہ کتاب بہت کوشش کے بعد حاصل کر کے اور جمع کرنے کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔ اس میں مجھ کو کافی پریشانی بھی ہوئی اور خاصی محنت بھی کرنی پڑی۔ لیکن اگر دل میں لگن ہو تو انسان سب کچھ آسانی سے کر سکتا ہے۔ ورنہ اس پریشان اور ویران زندگی میں اب نہ کوئی خواہش ہے نہ کوئی آرزو ع

پہلے تھیں اب سے دور بہت دل میں حسرتیں
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو!

لیکن جعفری جیسے عظیم انسان کے لیے میں جو کچھ بھی کروں وہ کم ہے۔ وہ ہر لحاظ سے عظیم تھے یہ چیز مجھ جیسی حقیر سے وہ کام لے رہی ہے جس کی نہ میں اہل تھی نہ میں نے کبھی ایسا کام کرنے کی جسارت کی تھی

یہ کتاب جس "کاروانِ گم گشتہ" کی روداد سفر ہے، سچ ہے کہ وہ کاروان گم ہو گیا لیکن میں نے یہ ورق ورق چن چن کر جمع کیے ہیں جو آپ کے سامنے ہیں۔ نہ میں کوئی پبلشر ہوں نہ ادیب۔ لیکن رئیس احمد جعفری اکیڈمی کے لیے میں اب میدان میں آ ہی گئی ہوں۔

یہ اکیڈمی میں نے خود بنائی ہے، جس کی طرف سے یہ دوسری کتاب منظر عام پر آ رہی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی جعفری صاحب کی تصانیف اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوں گی خدا میرا ساتھ دے تو یہ کام اپنے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ میں بہر حال اپنی حقیر زندگی اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر چکی ہوں۔

بیگم رئیس احمد جعفری

افتتاحیہ

حکیم محمد سعید

"کاروانِ گم گشتہ" مولانا سید رئیس احمد جعفری ندوی کی آخری کتاب ہے۔ "سیرتِ محمد علی" ان کی پہلی کتاب تھی جو انھوں نے شاید بیس اکیس برس کی عمر میں لکھی تھی اور اپنی صلاحیتوں کو منوالیا تھا۔ کاروانِ گم گشتہ ان کی وفات کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے درمیان کوئی دو سو کتابیں اور ہیں جو انھوں نے بہت سے موضوعات پر لکھیں۔ ان میں ناولیں بھی ہیں اور سوانح بھی، تاریخیں بھی ہیں اور تذکرے بھی، دینی کتابیں بھی ہیں اور سیاسی کتابیں بھی، ادبی موضوعات پر بھی ہیں اور تراجم بھی۔

نوعمری میں سیرت محمد علی سے ان کا قلم جو چلا تو آخری وقت تک چلتا ہی رہا۔ چالیس سال تک انھوں نے قلم کو ہاتھ سے نہیں رکھا اور کبھی کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کی۔ نہ ادبی زندگی کے شدائد و مصائب ان کے ہاتھ سے قلم چھین سکے اور نہ دوسری راہوں کی راحتوں نے انھیں اپنی جانب کھینچا۔ تخلیقِ ادب اور قلم کاری کی صعوبتوں کو جعفری صاحب سے زیادہ کون جانتا ہوگا لیکن ادب کا چسکا جس کو ایک بار لگ جائے وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جعفری صاحب میں تو بے نیازی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ضعفِ قلب اور پھر حملۂ قلب بھی ان کو لکھنے پڑھنے سے نہ روک سکے۔ اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ

معمول کے مطابق لکھتے رہے۔ اپنی مختصر سی عمر میں انھوں نے جتنا لکھا اتنا شاید ہی کسی اور نے لکھا ہو، ۵۷۔۵۸ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، لیکن اس عمر میں جعفری صاحب نے دو سو کتابوں کے علاوہ بے شمار مضامین بھی لکھے۔ روزنامہ خلافت، روزنامہ انقلاب، روزنامہ خورشید اور روزنامہ زمیندار کی سالہا سال تک ادارت بھی کی۔ ان روزناموں کے لیے انھوں نے اس طویل مدت میں نہ معلوم کتنے اداریے لکھے ہوں گے اور نہ معلوم کتنے شذرے اور کتنے مضامین۔ ہزارہا صفحات لکھنے کے لیے انھیں اپنی زندگی کے بیشتر لمحات قرطاس و قلم کے لیے وقف کر دینے پڑے ہوں گے۔ مجلسی زندگی، سیر و تفریح اور آرام کے لیے جس فرصت کی ضرورت ہے وہ ان کو میسر نہیں تھی۔ ذہنی مشقت اور دماغ سوزی کے لیے آدمی کو جم کر بیٹھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ورزش اور آرام کا موقع نہیں ملتا، نتیجۃً صحت روٹھنے لگتی ہے۔ اس لیے ادیب اکثر اپنی صحت خراب کر لیتے ہیں۔ جعفری صاحب بھی خدمتِ ادب کے جوش میں اپنی صحت کے تقاضے پورے نہ کر سکے اور ایک اچھا ادیب ہم سے چھن گیا۔

جعفری صاحب نے بہت سے موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں اور وہ مقبول بھی ہوئیں لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی دل چسپی کا موضوع برصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی اور قومی شخصیات تھا۔ اگرچہ سیرت محمد علی ان کا نقشِ اول ہے لیکن یہ ایک کامیاب کتاب ہے اور اس موضوع پر اب بھی بہترین کتاب کہی جا سکتی ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب "حیاتِ محمد علی جناح" ہے جو تقسیم سے قبل ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ پر پہلی کتاب ہے اور اس کو خود قائداعظم نے بھی پسند فرمایا تھا۔ قائداعظم کی عظمت کو سمجھانے اور آل انڈیا مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں اس کتاب کا بھی حصہ ہے۔ اسی طرح تحریکِ آزادی کی حمایت اور کانگریس اور اس کے رہنماؤں کی تردید و تکذیب میں جو کتابیں ان کے قلم سے نکلیں ان میں جعفری صاحب کا

خلوص اور جوش پوری طرح نمایاں ہے۔ 'کاروانِ گم گشتہ' بھی اسی موضوع پر ہے اور اس میں بھی ان کا مخصوص انداز اپنی پوری قوت اور رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب و نتائج بھی ہیں اور برصغیر کی سیاسی اور سماجی تحریکات کے مقاصد و اثرات کا تجزیہ بھی ہے۔ غیر مسلم شخصیات کا تاروپود بھی ہے اور مسلم زعماء کے افکار و اعمال بھی۔ کاروانِ گم گشتہ میں تحریک پاکستان سے قبل کی مسلم قیادت کا تذکرہ بھی ہے اور سیاسی، نیم سیاسی اور علمی شخصیات کی جھلکیاں بھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے تحریک پاکستان اور جنگِ آزادی کے پس منظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جعفری صاحب نے کئی سیاسی رہنماؤں اور مسلم اکابر کو قریب سے دیکھا اور جنگ آزادی کے دور عروج کے واقعات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا، اس لیے ان کے نقوش و تاثرات میں صداقت اور اثر ہے۔ یہ کتاب مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب تحریک و تاریخ پاکستان میں ایک مفید اضافہ ثابت ہوگی اور مستقبل کے مورخ کے لیے ایک اچھے ماخذ کا کام دے گی۔

"رئیس احمد جعفری اکیڈمی" کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے یہ اکیڈمی جعفری صاحب کی شخصیت اور فن پر جعفری صاحب کے بزرگوں، دوستوں اور مداحوں کے مضامین کا دلچسپ مجموعہ شائع کر چکی ہے۔ جعفری صاحب ایک انسان کی حیثیت سے بھی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے دوست، ایک مشفق باپ، ایک مثالی شوہر اور ایک مخلص ساتھی تھے۔ کم آمیزی، سادگی، انکسار، بے لوثی اور محنت و یکسوئی ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ یہ میرا اپنا مطالعہ بھی ہے اور ان کے تمام جاننے والوں نے بھی کم و بیش ان صفات کا اعتراف کیا ہے اور یہی خصوصیات جعفری صاحب کو ایک اچھے انسان اور اچھے ادیب کی حیثیت سے زندہ رکھیں گی۔

تحریکِ پاکستان سے قبل کی مسلم قیادت

چند مشاہیر و اکابر کا تذکرہ

(۱)

پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ ملت پاکستان ایک نوزائیدہ قوم ہے، اگرچہ یہ نیا ملک، اپنا ایک شاندار، درخشاں اور قدامت کے پیرہن میں لپٹا ہوا غیر فانی ماضی رکھتا ہے، اس کی قدامت اتنی ہی دیرینہ ہے جتنی ہمالیہ کی چوٹیاں، موہن جوڈارو ہڑپہ کی تہ بہ تہ اور زمین دوز بستیاں۔ اگرچہ یہ نئی قوم چودہ صدیوں کی تاریخ رکھتی ہے اور یہ تاریخ بصیرت افروز، روح پرور اور ولولہ آفریں روایات کا ایک مستند اور قابل فخر ذخیرہ رکھتی ہے۔ لیکن اس ملک کو پنجۂ اغیار اور شکنجۂ استبداد سے رہا ہو کر آزاد وجود کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔ اور اس قوم کو آزاد، خود مختار اور اپنی قسمت اور تقدیر کی تشکیل کا اقتدار حاصل کیے ہوئے ابھی چوتھائی صدی بھی نہیں گزری ہے، اس قوم اور اس ملک کا ماضی تاریخ کے سینہ میں ابدالآباد تک کے لیے محفوظ ہے، لیکن حیات نو کی وہ جنگ آزادی جو انگریزی سامراج اور ہندو استعمار سے لڑی گئی اور بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوئی، ہنوز قلم بند نہیں ہوئی ہے۔

پاکستان کی مستند، مکمل اور مفصل تاریخ کسی ایک شخص کے بس کی چیز نہیں ہے

لکھنے کے لیے مورخوں اور انشا پردازوں کا ایک پورا بورڈ چاہیئے۔ جو تحقیق و تفتیش کے بعد یہ تاریخ لکھے۔

لیکن تاریخ کہانی یا داستان کی طرح طبع زاد نہیں ہوتی۔ تاریخ لکھنے کے لیے مواد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماخذ کی ضرورت نہیں ہوتی، مصادر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر اس کے کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سوال یہ ہے کہ آیا تاریخ پاکستان سے متعلق ضروری مواد ہمارے پاس موجود ہے؟ بیان واقعات، اور اخذ و استدلال کے سلسلے میں جو ماخذ چاہئیں وہ کسی لائبریری یا کتب خانے میں موجود ہیں؟ حقائق کی تائید و توثیق کے لیے جو مصادر لازمی اور ناگزیر ہیں کیا ان تک ہماری رسائی ہے؟

جواب اگر دیا جا سکتا ہے تو نفی میں :-

پاکستان کی تاریخ قلم بند کرنے سے پہلے جس اقدام کی ضرورت ہے وہ یہ کہ "مواد خام" کی حیثیت سے جو واقعات و حقائق اب تک پردۂ خفا میں مستور ہیں انھیں منظر عام پر لایا جائے۔ اگرچہ وہ غیر مربوط ہی کیوں نہ ہوں، جب تک یہ خام مواد جمع نہیں ہو جاتا اس وقت تک پاکستان کی تاریخ لکھنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا،

لیکن یہ خام مواد حاصل کہاں سے ہو؟

اس کی ترتیب، تہذیب اور جمع و تبویب صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی نہج سے، تحریک پاکستان، قائد اعظم اور رہنمایان ملت کے دامن سے وابستہ رہے، جنھوں نے اس تحریک کو پروان چڑھتے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ جنھوں نے کتنی ہی معمولی حیثیت میں سہی، لیکن اس عظیم و جلیل تحریک میں حصہ لیا، جنھوں نے اس تحریک کے بانیوں، رہنماؤں اور قافلہ سالاروں کو قریب سے دیکھا اور جنھوں نے اس تحریک کے مخالفوں، حریفوں اور بدخواہوں کے اقدام و عمل کی نیرنگیوں کی جلوہ آرائی

بہ چشم خود دیکھی۔

اس تحریک کا اصل مرکز بمبئی تھا۔ تقریباً چودہ سال تک وہاں میرا قیام رہا۔ اس تحریک کے بطلِ جلیل مولانا شوکت علی کے سایۂ عاطفت سے بہرہ ور ہونے اور کافی مدت تک روزنامہ خلافت کی ادارت کا شرف حاصل کرنے کا مجھے موقع ملا۔

میں نے بہت کچھ دیکھا دور سے بھی قریب سے بھی اور جو کچھ دیکھا یقیناً تاریخِ پاکستان کے مصدر اور ماخذ کی حیثیت سے مستقبل کے مورخ کے کام آسکتا ہے۔

سب سے پہلے میں اس ماحول اور ان شخصیتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، شعور کی آنکھ کھول کر جن سے میں دوچار ہوا کہ آگے چل کر بار بار ان حضرات کا تذکرہ آئے گا اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اصل واقعات زیرِ بحث آئیں گے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ اسلام کے مجاہدوں اور غازیوں، ملت کے پاسبانوں اور رہنماؤں، قوم کے سرداروں اور ناخداؤں میں سے کئی کو میں نے قریب سے دیکھا، ان کے نطق و کلام اور کردار و سیرت کے مطالعے کا موقعہ ملا اور ان کے ایمان و استقامت، عزم و عمل، جاں سپاری اور فدائیت کی وہ چنگاری جو شعلہ بنی، پھر خاکستر بن کر فروغ جاوداں کی دولت سے بہرہ ور ہوئی، کئی مرتبہ میں نے اپنی آنکھوں سے چمکتی دیکھی وہ زمانہ اب گزر چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جگ بیت گیا۔ لیکن مرورِ ایام کے باوجود نقوش و تاثرات اتنے تازہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کا یہ واقعہ ہو۔

۳۵ سال سے کچھ زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی درجے کا ایک حقیر طالب علم تھا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد (دکن) کی زیرِ صدارت ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا، حاضرین میں ایک

بھاری بھرکم شخصیت تیونس کے جلاوطن باغی علامہ عبدالعزیز ثعالبی کی بھی تھی، علم و فضل کے اعتبار سے یگانہ، کردار میں مجاہد کی شان، عزم و عمل میں غازی کا ولولہ، فرانس کی قہرمانیت، اور استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، ہر چیز داؤں پر لگادی، قید و زنداں کی سختیاں سہیں، دار و رسن کو لبیک کہنے پر آمادہ تھے کہ جلاوطن کر دیے گئے وطن میں عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پردیس میں فقر و فاقے کی زندگی اختیار کرنا پڑی، لباس دریدہ اور شکستہ، جیب خالی، پاؤں میں ایک معمولی چپل، تقریر کی دعوت دی گئی، اسٹیج پر تشریف لائے وقار و تمکنت کے ساتھ کرسی پر بیٹھے، اور داد خطابت دینے لگے، اقبال نے جس "نطق اعرابی" کا ذکر کیا ہے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ایک غلام دوسرے غلام سے مخاطب تھا۔ لوگوں کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، اس کے منہ سے انگارے اور شعلے برس رہے تھے، یہ بغاوت کا نقیب تھا، یہ عشق بلاخیز کا پیامبر تھا، اس کا ایک ایک لفظ باغیانہ تھا، اور اس کی یہ بغاوت متعدی تھی اس نے قرآن کی آیتیں پڑھیں، حدیث کے حوالے دیئے، اسلاف کے واقعات سنائے، پھر کہا، فرانس، برطانیہ سے کہیں زیادہ شقی اور سفاک ہے، ہم اس سے لڑ رہے ہیں اور لڑتے رہیں گے، لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟ تم آزادی کیوں نہیں چھین لیتے؟ تم نے خلافت کی تحریک چلائی اور ساری دنیا میں غلغلہ مچا دیا، مگر اب تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ قیامت سر پر کھڑی ہے اور تم جاگنے کا نام نہیں لیتے؟ چند در چند وجوہ کی بنا پر مولانا شروانی کے لیے یہ تقریر بڑی صبر آزما تھی، خطیب پر بس نہیں تھا کہ اسے روک دیتے اپنے میں اتنا یارا نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہتے اتنے میں نماز کا وقت آگیا صدائے آذان بلند ہوئی اور مولانا کی مشکل حل ہو گئی انھوں نے اجلاس دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔

مولانا حسرت موہانی غیر منقسم ہندوستان کے رہنمایان آزادی میں مولانا

حسرت موہانی کے نام سے کون واقف نہیں؟ انھوں نے برطانوی استعمار کے خلاف عملی جدوجہد کا اس وقت آغاز کیا۔ جب گاندھی جی جنوبی افریقہ کے ایک غیر معروف وکیل تھے، موتی لال نہرو، اور دوسرے کانگریسی لیڈر حکومت برطانیہ کے نیازمند تھے، اور اس سے مخلصانہ تعاون کر رہے تھے، مولانا اس وقت جیل گئے جب سیاسی اسیروں کے لیے درجہ بندی نہیں ہوئی تھی لہٰذا وہ بھی اخلاقی قیدیوں کے ساتھ چکی پیستے اور مونج بٹتے تھے۔ اس زمانے میں مولانا نے کہا تھا ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

آدمی شروع سے مذہبی تھے، نماز روزے کے سختی سے پابند تھے، جیل میں بھی یہ وضع قائم رہی، اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

کٹ گیا جیل میں ماہ رمضاں بھی حسرت　　گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

مولانا شروع ہی سے آزادئ کامل کے طلب گار تھے، درجۂ نوآبادیت کا تصور بھی ان کے نزدیک معصیت تھا، ۱۹۲۸ء میں جب موتی لال نہرو نے، نہرو رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے پیش کی تو وہ لوگ بھی جو نہرو رپورٹ کی سفارشات سے سنگین اختلاف رکھتے تھے اس پر آمادہ ہو گئے کہ رپورٹ کے دفعات پر حسب موقع اپنے اختلافی خیالات کا اظہار ترمیم پیش کر کے کریں گے۔ لیکن اس رسمی تجویز کی تائید کریں گے جو پنڈت موتی لال نہرو کی کاوش اور محنت کے شکریے پر مشتمل تھی، تجویز پیش ہوئی، ہر مکتب فکر کے نمائندوں نے اس کی تائید کی اور عین اس وقت جب تجویز پر ووٹ لیا جانے والا تھا، اور اس کے بالاتفاق منظور ہونے کا اعلان کیا جانے والا تھا۔ مولانا حسرت اسٹیج پر تشریف لائے، انھوں نے فرمایا:۔

"پنڈت موتی لال نہرو ہرگز کسی شکریے اور سپاس کے مستحق نہیں ہیں انھوں نے اپنی رپورٹ میں درجۂ نوآبادیات کو منزل مقصود قرار دیا

ہے، یہ ملک کے ساتھ غداری ہے اور کسی غدار کے لیے شکریے کی تجویز ستم ظریفی کی انتہا ہے، ہماری منزل مقصود آزادئ کامل ہے اور اس سے کم پر ہم ہرگز راضی نہیں ہو سکتے"

مولانا کی اس تقریر نے قیصر باغ بارہ دری کے ہال میں سناٹا طاری کر دیا۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، لالہ لاجپت رائے، سر تیج بہادر سپرو، سوباش چندر بوس، جے ایم سین گپتا، مہاراجہ محمود آباد، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت مدن موہن مالویہ، سب دنگ تھے اس لیے کہ ابھی ابھی تائید کر کے بیٹھے تھے۔ موتی لال نہرو نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"مولانا میں آپ کی تائید کرتا ہوں، اور مجھے آپ سے ہمدردی بھی ہے اس لیے کہ ایوان کی عظیم اکثریت کے سامنے ہم دونوں کی حیثیت ایک حقیر اقلیت سے زیادہ نہیں"

مولانا نے جواب دیا:

"اس کے باوجود شکریہ کی تجویز کے بالاتفاق منظور ہونے کا اعلان نہیں کیا جا سکے گا۔ یہی میرا مقصد ہے!"

تجویز قہقہوں کے شور میں منظور ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا نے متعدد اہم تجویزیں پیش کیں۔ لیکن کوئی ترمیم بھی منظور نہ ہو سکی۔ ہر شکست کے بعد ایک تازہ ولولے کے ساتھ مولانا نئی ترمیم پیش کر دیتے۔ جلسہ جب ختم ہوا تو یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا دستخط لینے کے لیے ٹوٹ پڑے، مولانا ہر کاپی پر دستخط کے ساتھ اپنا کوئی شعر بھی ضرور لکھتے تھے، ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق　　حسرتِ سرفرازِ رسوائی

یہ شعر موقع کی مناسبت سے کچھ ایسا چسپاں تھا کہ دل پر نقش ہو گیا۔

مولانا انتہائی مذہبی آدمی تھے، تصوف کے لذت آشنا بھی تھے خاندان فرنگی محل میں بیعت تھے۔ جس طرح نماز روزے کے پابند تھے اس طرح اوراد و وظائف کی بھی پابندی کرتے تھے۔ بمبئی جب تشریف لاتے تو خلافت ہاؤس ضرور آتے، خلافت ہاؤس آتے تو میرے کمرۂ ادارت میں بھی ضرور قدم رنجہ فرماتے، غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ روسی ترکستان کا ایک خانماں برباد اور خانہ بدوش شخص میرے پاس آیا، اور مسلمانوں پر کمیونسٹوں کے مظالم کی داستان بیان کرنے لگا۔ اس نے استدعا کی کہ یہ باتیں روزنامہ خلافت میں شائع کردوں، اتفاق کی بات مولانا بھی تشریف رکھتے تھے، روسی ترکستان کا یہ شخص سوز و درد کے ساتھ اپنی داستان بیان کر رہا تھا کہ دفعتہً مولانا نے مداخلت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"بالکل جھوٹ! غلط!"

وہ شخص سراپا حیرت بن کر مولانا کو دیکھنے لگا یہی کیفیت میری تھی، مولانا نے ہم دونوں کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب فرمایا:

"آپ ان باتوں کا کیوں یقین کیے لے رہے ہیں یہ سب جھوٹ اور افترا ہے، نہ کمیونزم میں کوئی برائی ہے، نہ کمیونسٹوں میں، یہ دونوں انسانیت کے لیے رحمت ہیں!"

مولانا کی مولویانہ وضع قطع اور سج دھج دیکھ کر، اور مذہبی معاملات میں ان کے خشوع و خضوع سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث مجھے شدید حیرت تھی کہ یہ اتنے کٹر کمیونسٹ کیسے ہیں؟ ان کے کٹرپن کا اندازہ اس سے کرا کہ معاملات و مسائل میں اختلافی نقطۂ نظر وہ توجہ اور خاموشی سے سن سکتے تھے۔ لیکن کمیونزم کے خلاف ایک لفظ سننا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا، یہ معمہ میرے لیے آج تک معمہ ہی رہا کہ یہ عابد شب زندہ دار، یہ صوفی صافی، یہ ہر سال پابندی سے حج کرنے والا، مقامات مقدسہ اور عتبات عالیات

کا یہ مستقل زائر اتنا بڑا، اور بے لچک کمیونسٹ کیسے بن گیا؟ ایک طرف کمیونزم سے یہ لگاؤ دوسری طرف معرفت کا یہ عالم کہ فرماتے ہیں:

کام بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا　　کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا

مولانا محمد علی جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے عظیم وجلیل، لازوال اور غیر فانی کارنامے، تاریخ برصغیر کا ایک ناقابل فراموش باب بن چکے ہیں۔ محمد علی کی سیاست وصحافت صرف حق اور سچائی کے لیے تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کے دوست اور دشمن بدلتے رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور ناحق سے مقابلہ کیا، خواہ ناحق پر ان کا عزیز ترین دوست اور ساتھی کیوں نہ ہو۔ اور حق کا پرچم ان کے کسی حریف اور مخالف کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو شخصیت سے مرعوب ہونا اگرچہ وہ کتنی ہی بھاری بھرکم اور واجب الاحترام ہو انھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی اور کسی موقعہ پر حق سے روگردانی بھی کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ نواب محسن الملک کو جن کا وہ حد درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے علی گڑھ کے معاملات پر ایک تند و تیز خط لکھا اس خط میں انھوں نے لکھا تھا:

"شوکت کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں، لیکن اگر مجھے معلوم ہو کہ وہ باطل کا ساتھ دے رہے ہیں تو ایک چھری لوں گا اور ان کی گردن پر پھیر دوں گا اور پھر بتقاضائے طبیعت وہی چھری اپنے حلق پر پھیر لوں گا۔"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی، محمد علی کے مرشد تھے، لیکن آویزش نجد وحجاز کے زمانے میں مولانا کا مسلک محمد علی کے نزدیک غلط تھا۔ انھوں نے بلا تامل اپنے مرشد سے اختلاف کا اظہار کیا۔ نوبت قریب قریب فسخ بیعت تک پہنچ گئی اور یہ صورت

محمد علی کے لیے حد درجہ اذیت قلب کا سبب تھی۔ لیکن وہ اپنے مسلک پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ مہاراجہ اندور سے محمد علی کے ذاتی اور خاندانی تعلقات تھے لیکن جب وہاں ہندو مسلم فساد ہوا مسلمان ہدف ستم بنے، ڈاکٹر کچلو مسلمانوں کی پیروی کے لیے وہاں پہنچے اور فوراً ہی ریاست میں ان کا قیام ممنوع قرار دیا گیا تو محمد علی نے وہ سنگین اختلافات فراموش کر دیئے جو ڈاکٹر کچلو سے چلے آ رہے تھے اور ان دیرینہ و مستحکم خاندانی تعلقات کو نظر انداز کر دیا جو مہاراجہ اندور سے قائم تھے، ہندو میں انھوں نے پوری قوت سے مہاراجہ کی مخالفت کی اور ڈاکٹر کچلو کے عزم و ہمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ مہاراجہ محمود آباد اور سر آغا خاں محمد علی کے محسن تھے۔ لیکن جب ایک نازک ترین مرحلے پر انھوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں سے تعاون کیا تو محمد علی نے بغیر کسی جھجک کے اپنے اخبارات میں ان دونوں حضرات پر سخت و شدید لہجے میں نکتہ چینی کی، نواب صاحب رامپور ان کے مربی تھے۔ ان کے خاندان کے سرپرست تھے، ذاتی طور پر ان کے مداح، ثنا خواں اور قدر داں تھے لیکن حادثہ مسجد کانپور کے زمانے میں اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے وقت محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد میں ان کی سیاست اور ان کے انداز سیاست سے شدید اختلاف کیا، اس جرم میں ان کی جائداد ضبط کر لی گئی وہ اپنے حقوق سے محروم ہو گئے ریاست میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور کئی سال تک وہ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکے لیکن اپنے مسلک میں نواب صاحب کی وجہ سے نرمی پیدا کر لی ہو ایسا نہیں ہوا۔ کراچی کے ششن کورٹ میں جب ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا تو انھوں نے کسی طرح کی ہچکچاہٹ ظاہر کیے بغیر اپنے باغی ہونے کا اعتراف کر لیا اور ہنستے مسکراتے جیل چلے گئے بقول خود

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

ہر موقع پر سچی بات کہنا، نتائج و عواقب سے بے پرواہ اپنے افکار و خیالات کا

اظہار کرنا، پرائیویٹ اور پبلک کی دیوار کو گرا کر اپنی ذات کو پبلک بنا دینا محمد علی کی خصوصیت تھی۔

حجاز پر قبضہ کرتے وقت سلطان ابن سعود نے وعدہ کیا تھا کہ وہاں سلطان بننے نہیں جا رہے ہیں، محمد علی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حجاز پر کسی فرد یا قائد کی حکومت نہیں ہونی چاہیئے اس مقدس سرزمین پر ہر مسلمان کا حق ہے لہٰذا اس پر عالم اسلام کی حکومت ہونی چاہیئے ایک ایسی ہیت حاکمہ قائم ہونی چاہیئے جس میں تمام مسلم ممالک کے منتخب نمائندے شریک ہوں اس مسلک کی روشنی میں سلطان کا وعدہ ان کے لیئے حد درجہ تسلی بخش ثابت ہوا اور انھوں نے ان کی تائید و حمایت شروع کر دی۔

لیکن قبضے اور تسلط کے بعد باشندگان حجاز کے اصرار سے مجبور ہو کر سلطان حجاز کے شاہ ذی جاہ بن گئے، محمد علی کو اس فیصلے سے تکلیف پہنچی، سلطان کی طلب کردہ پہلی موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے وہ حجاز تشریف لے گئے، حجاز کا یہ پہلا سفر تھا، نیت حج اور زیارت کی بھی تھی ان کی غیرت نے گوارہ نہیں کیا کہ مصارف سفر مجلس خلافت سے وصول کریں، کچھ جائیداد جو بچ رہی تھی وہ بیچی کچھ بیگم محمد علی کا زیور بیچا اور تشریف لے گئے۔

موتمر پر مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا چھائے ہوئے تھے وہ سلطان کے مقرب خاص تھے اور سلطان کو سلطان حجاز بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اجلاس کا افتتاح سلطان نے بنفس نفیس کیا اور موقع کی مناسبت سے ایک موثر اور طویل تقریر بھی فرمائی اور کتاب و سنت کی روشنی میں حکومت کرنے کا اعلان کیا اس موقع پر محمد علی خاموش نہ رہ سکے انھوں نے برملا سلطان کو مخاطب کر کے کہا:-

"لیکن قیصر و کسریٰ کی جس سنت پر آپ عمل کر رہے ہیں پہلے اسے تو ترک کریں"

محمد علی کے یہ الفاظ کانفرنس کے پنڈال پر بجلی بن کر گرے، سناٹا چھا گیا، سلطان ناگواری کے ساتھ اٹھے اور تشریف لے گئے اور پھر موتمر کے کسی اجلاس میں شریک

نہیں ہوئے، کانفرنس میں ایران، ترکیہ اور دوسرے آزاد ممالک کے نمائندے بھی موجود تھے لیکن ایک غلام ملک کے باشندے کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ رشک اور حسرت کی نظر سے اس مرد قلندر کو دیکھنے لگے۔

اسی طرح کا مظاہرہ محمد علی نے ہندوستان میں بھی وقت آنے پر کیا، مرکزی اسمبلی نے سارداایکٹ پاس کر کے جب کم سنی کی شادی ممنوع قرار دی تو محمد علی نے مسلمانوں کے لیے بعض استثنائی صورتوں میں اس کے قانونی جواز کا مطالبہ کیا حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی یہاں تک کہ بل ایکٹ بن گیا محمد علی ایک وفد لے کر وائسرائے ہند، لارڈ اردن کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا مطالبہ دہرایا۔

وائسرائے نے جواب دیا:

"ہندوستان میں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مفاد عمومی سے نہ ٹکرائے۔ اس صورت میں حکومت کے قانون کو بالادستی حاصل ہوگی اور اس کا نفاذ بہرحال کیا جائے گا"

محمد علی نے جواب دیا:

"میں قانون پر مذہب کی بالادستی کا قائل ہوں، لہٰذا اسے بجنسہٖ اسی صورت میں مسلمانوں پر نافذ نہیں ہونے دوں گا"

وائسرائے نے تھوڑے تامل کے بعد کہا:-

"مجھے یقین ہے اس سے آپ کی مراد قانون شکنی نہیں ہے"

محمد علی نے جواب دیا:-

اس یقین میں آپ کے ساتھ میں شریک نہیں ہوں، کیوں کہ میری مراد قانون شکنی ہی ہے"

اور پھر اس کے بعد اخبار میں اعلان کر کے محمد علی نے قانون شکنی کی مگر حکومت

ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکی۔

محمد علی شیکسپیئر کے جس طرح بہت بڑے نقاد تھے۔ اسی طرح آرٹ کے بھی اداشناس تھے۔ ان کے ڈرائینگ روم میں ایسی بہت سی تصویریں آویزاں تھیں جو ان کے نزدیک آرٹ کا شاہکار تھیں ان میں جہاں مردوں اور بچوں کی تصویریں تھیں وہاں عورتوں کی بھی تھیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کا محمد علی بہت احترام کرتے تھے، آخر میں دونوں کے مابین فکر و نظر کا شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر بھی یہ اختلاف احترام کے راستے میں حائل نہیں ہوا، مولانا حسین احمد عرف ایک عالم دین ہی نہیں تھے، صوفی اور مرشد بھی تھے زاہد اور متقی بھی قائم اللیل اور صائم النہار بھی تھے وہ محمد علی کے ہاں آتے تو ان تصویروں کو دیکھ کر بہت جز بز ہوتے آخر ایک روز ضبط نہ کر سکے تصویروں کے عدم جواز کا ذکر کرتے ہوئے اصرار کیا کہ یہ تصویریں ڈرائینگ روم سے ہٹا دی جائیں لیکن محمد علی نے اس اصرار کے سامنے سر نہیں جھکایا، نہ مطلق طور پر تصویروں کے عدم جواز کا فتویٰ تسلیم کیا وہ اپنے دلائل رکھتے تھے اور جب تک انشراح قلب کے ساتھ قائل نہ ہو جائیں کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اپنی بات ان سے نہیں منوا سکتی تھی خواہ خود ان کی نظر میں کتنی ہی معزز اور محترم کیوں نہ ہو۔

لاہور کے ایک گندہ دہن پبلشر راج پال نے ایک کتاب شائع کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نہایت رکیک و کثیف حملے کیے گئے تھے معاملہ عدالت تک گیا ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس دلیپ سنگھ نے ملزم کو بری کر دیا اس فیصلے نے مسلم ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا چونکہ واقعہ لاہور کا تھا اس لیے یہاں کا جوش و خروش حد بیان سے باہر تھا اخبارات نے اداریے لکھے اور جسٹس دلیپ سنگھ سے مطالبہ کیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں کیوں کہ ان کا یہ فیصلہ انصاف سے دور اور تعصب سے قریب تھا۔ جن اخبارات نے یہ اداریے لکھے تھے، ان پر توہین عدالت کا مقدمہ چلا۔ اور ان کے

ایڈیٹر جیل بھیج دیئے گئے۔

محمد علی کی ساری زندگی عشق رسولؐ کی پرتو تھی آنحضرتؐ کا نام آیا اور آپ اشکبار ہوئے سب لوگ سے توقع تھی کہ دلیپ سنگھ استعفادو کی تحریک میں وہ پیش پیش ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا انھوں نے کامریڈ میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا :۔

" قصور قاضی کا نہیں قانون کا ہے "

یعنی تعزیرات ہند میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جس کی رو سے کسی ایسے شخص کو جو انبیاء اور بزرگان دین کی توہین کا مرتکب ہو سزا دی جا سکے۔ دلیپ سنگھ اگر استعفادے بھی دیں تو ان کی جگہ جو دوسرا جج آئے گا۔ وہ بھی یہی فیصلہ دے گا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ دلیپ سنگھ سے استعفا طلب کیا جائے حکومت کو ایک تعزیری قانون بنانے پر مجبور کیا جائے۔

شروع شروع میں محمد علی کی اس رائے سے سخت اختلاف کیا گیا۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور محمد علی سے اس سلسلے میں جو طویل خط و کتابت ہوئی وہ میں نے محمد علی کی فائل میں دیکھی تھی، میر صاحب اگرچہ محمد علی کی اصابت رائے کے قائل تھے لیکن بہ اصرار التجا کر رہے تھے کہ اس مسئلے پر سکوت اختیار کریں ورنہ ان کی قیادت خطرے میں پڑ جائے گی۔ محمد علی کا جواب یہ تھا قیادت اس لیے ہوتی ہے کہ رائے عامہ کی رہنمائی کرے اس لیے نہیں ہوتی کہ اپنے تحفظ کے لیے رائے عامہ کی قیادت قبول کرلے، آغاز میں تو واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی قیادت کا آفتاب غروب ہوا، لیکن بہت جلد حالات نے پلٹا کھایا اور بالآخر تمام زعما اس رائے سے متفق ہو گئے کہ قانون بدلوانا چاہیئے۔ محمد علی نے خود قانون کا مسودہ تیار کیا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حاجی سر عبداللہ ہارون نے اسے مرکزی اسمبلی میں پیش کیا اور غیر معمولی کثرت آراء سے منظور ہو گیا۔

ہندوستان کے والیان ریاست میں مہاراجا الور کو شیفتگی کی حد تک محمد علی سے تعلق خاطر تھا۔ وہ ان کی قابلیت، ذہانت، فراست اور خدمات کے بہت زیادہ معترف تھے۔ نواب صاحب رام پور سے ان کے برادرانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے لیکن محمد علی کی خاطر نواب صاحب سے لڑ گئے۔ اور پھر آخر وقت تک دونوں کے تعلقات استوار نہیں ہو سکے۔ بات صرف اتنی تھی کہ نواب صاحب رامپور میں محمد علی کے داخلے پر سے پابندی ہٹانے کو تیار نہیں تھے۔

محمد علی کو انھی مہاراجا الور نے اپنے جشن سال گرہ پر بڑے اشتیاق و اصرار کے ساتھ الور مدعو کیا محمد علی گئے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے متعدد والیان ریاست اور حکومت ہند کے اعلیٰ حکام و افسران، کراؤن ریپریزنٹیو اور رزیڈنٹ وغیرہ سب موجود تھے ہندوستان کے والیان ریاست میں مہاراجا الور غیر معمولی صفات کے حامل تھے وہ بہترین سیاست دان تھے عصری علوم پر ان کی گہری اور وسیع نظر تھی۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے، برجستہ تقریر کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس موقع پر انگریز اور ہندوستانی اکابر نے جو تقریریں کیں ان میں مہاراجہ کے ان اوصاف کو بہت سراہا۔ محمد علی سے بھی تقریر کے لیے اصرار کیا گیا۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"مہاراجا کے یہ سب اوصاف و کمالات درست اور بجا لیکن میرے نہاں خانۂ تصورات میں کسی ہز میجسٹی یا ہز ہائی نس کی گنجائش نہیں ہے، میں مہاراجا کو جمہوریۂ ہند کا آئینی صدر مملکت بنانے پر بخوشی رضامند ہو سکتا ہوں، لیکن فرماں روائے مطلق بنانے پر نہیں!۔ ایک چھوٹی سی ریاست کا بھی نہیں!"

مہاراجا کے جشن سالگرہ کے موقع پر ہر سال اردو اور انگریزی کے اخبارات

خصوصی نمبر نکالتے تھے اور دامن امید گوہر آرزو سے بھر لیتے تھے۔ ہمدرد ابھی نے چاہا کہ اس طرح کا ایک خصوصی نمبر ہمدرد کا بھی نکلے۔ یہ بات جب محمد علی تک پہنچی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے فرمایا:-

"خاص نمبر نکالنا میرے اصول کے خلاف ہے، ہمدرد کا آج تک کوئی خاص نمبر شائع نہیں ہوا، نہ آئندہ ہوگا۔"

ظاہرداری، دکھاوا، تصنع، نمائش، وقتی مصلحت، یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ محمد علی کی لغت میں موجود نہیں تھے، نہ وہ اپنی کمزوری کی تاویل کرتے تھے، نہ انھیں اپنی شخصیت پر ناز تھا، لوگ انھیں ضدی کہتے ہیں۔ اگر اصول کا نام ہی ضد ہے تو بے شک وہ بڑے ضدی تھے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو وہ صرف اصول پرست تھے، اگر یہ کوئی جرم ہے تو بے شک وہ مجرم تھے، اور اگر یہ کمزوری ہے تو یہ کمزوری بدرجۂ اتم ان میں پائی جاتی تھی۔

مجلس خلافت کی مالی حالت، قوم کی بے حسی اور سرد مہری کے باعث حد درجہ سقیم ہو رہی تھی۔ جوش و خروش کا دور ختم ہو چکا تھا۔ کسمپرسی اور بے اعتنائی کا دور جاری تھا تعلیم بالغاں، نیشنل والنٹیر کور کی آل انڈیا تنظیم، کھدر کی ترویج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ماہانہ مالی امداد اور متعدد تعمیری، تعلیمی اور سیاسی کام انھوں نے جاری کر رکھے تھے۔ اور ان سب پر کافی رقم ہر مہینے خرچ کرنی پڑتی تھی، سرمایہ ناپید تھا، مصارف میں کمی ممکن نہیں تھی۔ شوکت صاحب سخت پریشان تھے کہ سارا بار انہی کے دوش زبردست پر تھا۔ اسی اثنار میں رنگون کے ایک یمین تاجر کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ اگر مولانا محمد علی برما کا دورہ کریں۔ اور وہاں کے مسلمانوں کے سامنے تقریر کریں تو مجلس خلافت کے لیے دو تین لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا ذمہ وہ لیتے ہیں۔ خود محمد علی بھی اس زمانے میں ذاتی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ خود ذیابیطس کے مریض، جہیتی لڑکی بستر علالت پر۔ جو بہت جلد بستر مرگ بننے والا تھا، ہمدرد اور کامریڈ کی پریشانیاں، رفقار کار کا قحط، لیکن

مجلس خلافت کے لیے اپنی ذاتی پریشانیوں کو فراموش کر کے وہ رنگون روانہ ہو گئے۔

رنگون میں محمد علی کا شاہانہ استقبال ہوا۔ اتنا بڑا جلوس آج تک کسی سیاسی زعیم کا وہاں نہیں نکلا تھا، مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز ختم ہو گیا تھا جلسے شروع ہوئے تو ان کا بھی ریکارڈ قائم ہو گیا۔ انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے وسیع و عریض جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہتی تھی، لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے، درختوں اور چھتوں پر بھی لوگ تقریر سننے اور زیارت کرنے کی دھن میں بیٹھے نظر آتے تھے، قیام گاہ پر بھی ہر وقت مشتاقان دید کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا محمد علی کی تقریروں نے ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش اور ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا، اسلامیت کا جوش، اسلامی قومیت کا مسئلہ اور اسلامی وحدت کا جذبہ۔ محمد علی سے پہلے جواہر لال، گاندھی جی وغیرہ رنگون کا دورہ کر چکے تھے اور قومیت متحدہ کا صور پھونک آئے تھے، لیکن محمد علی کی تقریروں نے اس طلسم کا پردہ چاک کر دیا۔

مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، محمد علی کو ڈرامے سے بڑا شغف تھا۔ شیکسپیئر پر تو وہ اتھارٹی مانے جاتے تھے، تھیٹر اور سینما سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ کوئی اچھی فلم آجائے تو ضرور دیکھتے تھے۔ رنگون کے دوران قیام میں ان کی ایک پسندیدہ فلم آئی چند احباب کے ساتھ اسے دیکھنے چلے گئے واپس آئے تو میزبان نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا:-

"آپ کی سینما بینی سے اندیشہ یہ ہے، کہیں عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ یہاں کے لوگ اگر بھڑک گئے اور مخالفین بھڑکانے پر تلے ہوئے ہیں، تو مجلس خلافت کے لیے چندہ فراہم کرنے میں بھی دشواری پیش آئے گی، لہٰذا اگر سینما دیکھنا ہی ہے تو آخری شو دیکھ لیا کیجئے"

محمد علی نے یہ باتیں سنیں۔ جواب میں کہا:-

"میری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، میں سینما بینی کو حرام نہیں سمجھتا اور عقیدت مندوں کے ڈر سے اپنی روش نہیں بدل سکتا۔ نہ چشم مردم سے چھپنے کے لیے آخری شو کا انتخاب کروں گا۔ میرا ارادہ نہیں تھا کہ کل بھی سینما جاؤں، لیکن اب جاؤں گا۔ باقی رہا مجلس خلافت کا چندہ تو وہ اگر اس شرط پر مل سکتا ہے کہ اپنا ظاہر کچھ رکھوں اور باطن کچھ تو مجھے نہیں چاہیئے! میں پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔"

میزبان نے پاؤں پکڑ لیے مگر محمد علی اپنی ہٹ پر قائم رہے۔

محمد علی کو غصہ جلد آجاتا تھا۔ لیکن ان کے غصے میں بھی ایک بانکپن تھا۔ اور شوخی، بذلہ سنجی اور طنز لطیف کے تو وہ بادشاہ تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا، ذرا سے لفظی ہیر پھیر سے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا۔ چٹکیاں اور گدگدیاں ان کا خاص فن تھا۔ اور اس فن میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

عطیہ بیگم کی موجودگی میں ایک مرتبہ بمبئی کی سڑکوں کے نام زیر بحث آئے "گرانٹ روڈ" کے ذکر پر انھوں نے تڑخ کر کہا:۔

"اس کا نام تو "شارع عطیہ" ہونا چاہیئے۔"

محفل کشت زار زعفران بن گئی۔

علی گڑھ کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے اجتماعات میں حتی الامکان پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبدالمجید خواجہ کے دولت کدے پر چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سر ضیاء الدین بھی اس موقع پر موجود تھے۔ محمد علی شریفے کھا رہے تھے اور بیج زمین پر پھینک رہے تھے۔ ایک دوست نے کہا:۔

"محمد علی تمیز سے کھاؤ۔ بیج زمین پر کیوں پھینک رہے ہو"؟

محمد علی نے جواب دیا:۔

"اس لیے کہ یہاں شریفوں کی بہت کمی ہے۔"

الناظر لکھنؤ کے ایڈیٹر مولانا ظفرالملک علوی، سچ بات کہنے میں شمشیر برہنہ تھے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ محمد علی اُن کے بارے میں کہا کرتے تھے۔

"لوگ سچ کو کڑوا سمجھتے ہیں، ظفرالملک کے نزدیک کڑواہٹ کا نام سچ ہے۔"!

نہرو رپورٹ کے زمانے میں محمد علی پٹنہ تشریف لے گئے۔ وہاں پروفیسر عبدالباری اور مسٹر عبدالباری کانگریس کے زبردست کارکن اور نہرو رپورٹ کے پرجوش حامی تھے نہرو رپورٹ اور کانگریس کی حمایت میں ان دونوں نے ایک پمفلٹ اس جلسے میں تقسیم کیا جس میں محمد علی تقریر کے لیے آئے تھے۔ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا!

"جن لوگوں کو جھوٹ بولنے کا فن سیکھنا ہو، وہ "باری باری" سے سیکھیں"!

مولانا محمد علی اور شوکت علی کے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں گوہر، داغ کے شاگرد اور بہت اچھے نغز گو تھے، لیکن ان کا مذہبی عقیدہ، اور سیاسی مسلک، علی برادران سے جدا تھا۔ چھ سال کے لیے، محمد علی جب چھنڈواڑہ میں نظر بند اور بیتول جیل میں قید ہوئے تو گوہر نے، گویا معذرت کرتے ہوئے انھیں لکھا۔

جور اعدا کے گلے، تیری جدائی کے گلے
اس دل تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

محمد علی نے جواب میں لکھا:-

خوف غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی

روزنامہ سیاست لاہور کے مدیر شہیر مولانا سید حبیب مرحوم کی محمد علی سے نہیں بنتی تھی، دونوں کے مسلک میں بُعد المشرقین تھا۔ صرف مسلک ہی میں نہیں طبیعت، مزاج، کردار، سیرت اور سیاست میں بھی،

ایک مرتبہ مولانا سید حبیب نے "سیاست میں ایک طویل مقالہ افتتاحیہ محمد علی اور ان کی سیاست پر لکھا، اس میں کہیں انھیں "خوفناک" قرار دیا کہیں "خطرناک"

کہیں ان کی حالت "عبرتناک" بتائی، کہیں ان کے سیاسی مسلک کو ملک و ملت کے لیے "اندوہناک" قرار دیا، کہیں ان کی روش کو قوم کے لیے "المناک" فرمایا، کہیں "شرمناک"

محمد علی نے اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:۔

"مگر ان ساری باتوں میں "پیچ ناک" ایک بات بھی نہیں"

شعیب قریشی

جن لوگوں نے محمد علی کے زیر سایہ سیاسی تربیت حاصل کی، اُن میں شعیب قریشی مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں شعیب صاحب علی گڑھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے، علی گڑھ سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا، لندن سے بیرسٹری کا۔ ۱۹۲۰ء میں محمد علی جب وفد خلافت لے کر لندن پہنچے تو یہ تعلیم حاصل کر رہے تھے محمد علی کے پہنچتے ہی ایک سال کے لیے تعلیم ملتوی کی اور وفد کے کارگزاروں میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں ڈاکٹر انصاری کے طبی وفد کے ساتھ جو محمد علی نے ترکیہ بھیجا تھا، شریک ہو کر قسطنطنیہ پہنچے اور گراں بہا خدمات انجام دیئے انگریزی اتنی اچھی لکھتے تھے کہ کامریڈ کے بند ہونے کے بعد راجہ غلام حسین مرحوم کے ساتھ جو محمد علی کے دست راست رہ چکے تھے لکھنؤ سے "نیو ایرا" نکالا جو بہت مقبول ہوا، پھر گاندھی جی کو جب چھ سال کی سزا ہوئی تو انھوں نے "ینگ انڈیا" کا ایڈیٹر شعیب صاحب ہی کو نامزد کیا۔ اسی جرم میں دو سال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد شعیب صاحب، مرکزی مجلس خلافت کے آنریری سکریٹری ہو گئے۔ انھوں نے جس بے لوثی اور خلوص کے ساتھ قوم کی خدمت کی۔ اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ کبھی ایک پیسہ بھی قومی فنڈ کا اپنی ذات پر خرچ نہ ہونے دیا رہتے خلافت ہاؤس میں تھے کام خلافت کا کرتے تھے لیکن کھانا کبھی مفت نہیں کھایا ہر ماہ پابندی کے ساتھ بل ادا کرتے تھے۔ آبائی جائیداد نے جب تک ساتھ دیا اسے فروخت کر کر کے اپنے مصارف پورے کرتے رہے جب وہ ختم ہو گئی تو نواب حمیداللہ خاں

والی بھوپال نے جو علی گڑھ کے ساتھی تھے اپنے پاس بلالیا اور زبردستی وزارت کا منصب سونپ دیا۔ وزارت بھی اس دیانت سے کی کے دوست دشمن سب سے خراج تحسین وصول کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے نگراں کار بن گئے۔ شعیب صاحب اس کمپنی کے بانیوں میں تھے، پھر لیاقت علی خاں کی نگاہ انتخاب نے پاکستان کا سفیر بنا کر روس بھیج دیا ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور مرکزی حکومت کے وزیر بھی رہے، میں نے ایک مرتبہ ان سے عرض کیا تھا کہ "تحریک خلافت کی تاریخ"، سرکاری وسائل وذرائع کو بروئے کار لاکر مرتب کرائیں، کانگریس نے اپنی داستان کو تاریخ بنا دیا ہے حیف ہے اگر ہم تاریخ کو افسانہ بنا دیں، میری یہ گزارش توجہ سے سنی، اور اس سلسلے میں امکان استطاعت کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ کیا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ سیاسی حالات بار بار پلٹا کھا رہے تھے، اسی الٹ پلٹ میں ان کی وزارت بھی جاتی رہی۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

نہرو کمیٹی کے ایک رکن شعیب صاحب بھی تھے، موتی لال ان کا اتنا ہی خیال کرتے تھے جتنا جواہر لال کا، یہ بھی ان کا قرار واقعی احترام کرتے تھے لیکن نہرو کمیٹی نے ترتیب دستور کے وقت جب مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کو پامال کرنا چاہا تو شعیب صاحب، ذاتی تعلقات و روابط کو بالائے طاق رکھ کر مقابلے میں ڈٹ گئے، موتی لال خفا ہو گئے، ڈاکٹر انصاری سے دیرینہ اور انتہائی مخلصانہ تعلقات تلخ ہو گئے۔ گاندھی جی نے "متعصب مسلمان" کا خطاب دیا، جواہر لال سے ان بن ہو گئی، لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی اور زبردست اختلافی نوٹ لکھا، وہ نوٹ اتنا سخت اور سنگین تھا کہ موتی لال کی ہمت نہیں پڑی کہ نہرو رپورٹ کے ساتھ اسے شائع کر سکیں، اس پر مجلس خلافت کی طرف سے سخت احتجاج بھی کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ وہ اختلافی نوٹ شائع کیا جائے، آخر بعد از

خرابی بسیار اسے الگ سے ایک مدت گزرنے کے بعد شائع کیا گیا، اس واقعے سے شعیب صاحب اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سیاست ملکی سے قریب قریب انھوں نے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔

رؤف بے ترکیہ کی تاریخ حریت میں، رؤف بے، اور خالدہ ادیب خانم کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ان دونوں نے جس بے جگری، بے خوفی اور جرأت کے ساتھ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کا ساتھ دیا وہ ترکیہ کی تاریخ استقلال کا ایک زریں باب ہے، لیکن ترکیہ کی آزادی کے بعد ان دونوں کو جلا وطن ہونا پڑا، اتاترک ان کا فکری اختلاف نہیں برداشت کر سکے، انھیں جلا وطنی کا حکم ملا، اور یہ اپنے اس محبوب وطن سے رخصت ہو گئے، جس کی آزادی کے لیے انھوں نے تن من دھن کی بازی لگائی تھی۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم طبی وفد کے قائد کی حیثیت سے عرصے تک ترکی میں مقیم رہے تھے اور ان کے تعلقات ترک زعماء سے بہت گہرے اور دوستانہ تھے ۱۹۳۳ء میں جامعہ ملیہ کے چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے رؤف پاشا کو توسیعی خطبات دینے پر مجبور کیا۔ جلسے کے منتظمین میں طلبہ بھی شریک تھے اور ان میں ان سطروں کا لکھنے والا بھی شامل تھا، جلسے کی صدارت ہر روز ملک کا کوئی ممتاز فرد کرتا تھا، سر راس مسعود اور علامہ اقبال نے بھی ایک ایک جلسے کی صدارت فرمائی۔

رؤف پاشا کی شخصیت ہندوستان میں غیر معروف نہ تھی ان کے جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کارنامے مولانا محمد علی نے کامریڈ میں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں، اس شان سے متواتر اور مسلسل شائع کیے تھے کہ ملک کے اردو داں اور انگریزی خواں پبلک ان سے ایک والہانہ تعلق محسوس کرنے لگی تھی۔ رؤف پاشا خلیفۃ المسلمین کی بحریہ کا امیر البحر اور حمیدیہ ناخدا جس نے دشمن کے کئی جہاز غرق کر دیئے اور اپنے جہاز پر آنچ بھی نہ آنے دی، دلی آیا تو خلقت شوق دیدار

میں دیوانہ وار ٹوٹ پڑی، قرول باغ میں جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ایک کا ہال، سامعین اور مشتاقان دید سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جلسہ گاہ سے باہر بھی ہزاروں آدمی صفیں باندھے کھڑے تھے۔

افتتاحی اور صدارتی تقریر کے بعد رؤف پاشا کھڑے ہوئے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے غیر فانی کارنامے انجام دیے تھے، لیکن اس مجاہد، اس غازی اس تیغ زن پر اپنے ملک کی زمین تنگ ہوگئی۔ دیار غیر میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن اپنی قوم کی شان میں رطب اللسان، اپنے ملک کے لیے آتش بجاں، اور اپنے قائد کا مداح اور ثنا خواں تھا۔

ترکیہ کے ماضی اور حال پر رؤف پاشا نے کئی تقریریں کیں، لیکن کسی تقریر میں نہ اتاترک کی تنقیص تھی، نہ دستور حکومت پر تنقید، جہاد آزادی کی ایک داستان تھی اور داستان گو وہ جو خود اس کہانی کا ایک ہیرو تھا!

لوگ منتظر تھے کہ رؤف پاشا دستور حکومت پر بیدردی کے ساتھ نکتہ چینی کریں گے، اتاترک کے اسرار درون پردہ آشکار کریں گے، ملکی اور ملی سیاست کے بخیے ادھیڑیں گے لیکن توقع پوری نہ ہوئی، تقریر کے آخر میں سوالات کی اجازت تھی، ایک صاحب سے نہ رہا گیا، سوال کیا:-

"اتاترک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

رؤف پاشا نے جواب دیا:-

"جو، ہر ترک کی ہے،!" — بہت اچھی"!

پھر سوال ہوا؟:-

"لیکن آپ کے اور اتاترک کے مابین تو شدید اختلافات ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ آپ وطن سے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں؟"

رؤف پاشا کا سرخ و سفید چہرہ تمتما اٹھا، انھوں نے ایک فوجی کے تیور سے جواب دیا:-

"میرے اختلافات کا تعلق بیرونی دنیا سے نہیں ہے۔ یہ طویل سفر میں نے اپنے ملک کے خلاف زہر چکانی کے لیے نہیں اختیار کیا ہے، ترکیہ کی حیات نو اتاترک کی رہین منت ہے اور ہر ہر ترک ان کے اس عظیم اور لازوال کارنامے کو عظمت کی نگاہ سے دیکھنے اور عقیدت کے ساتھ یاد رکھنے پر مجبور ہے!"

کامریڈ اور الہلال کی تحریروں نے رؤف پاشا کی جو عظمت میرے دل میں پیدا کی تھی ان کے اس جواب نے اسے عقیدت میں تبدیل کر دیا۔

مولانا شوکت علی ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں میں، مولانا شوکت علی کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا، واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت بڑے آدمی تھے، صرف تن و توش کے اعتبار سے نہیں، کردار و سیرت کے اعتبار سے بھی۔ ان کی خدمت میں کئی سال رہ کر میں نے یہ جانا کہ قوم کا خادم قوم کا مخدوم کس طرح بنتا ہے؟ اور قوم کے مخدوم کو کس طرح کی زندگی بسر کرنی چاہیئے؟ اور قوم کی ناخدائی کرنے والے کو کیوں کر اپنی جان، اپنے مال، اور عزیز ترین چیزیں قربان کرنے پر تیار رہنا چاہیئے؟

شوکت صاحب خوش خوراک تھے، خوش لباس تھے، خوش اوقات تھے، لیکن اسی وقت تک جب تک ان کے پاس دھن تھا، پنشن ضبط ہوئی، جائداد بک گئی، وہ قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگے، ہفتے گزر جاتے تھے گوشت کی صورت دیکھنے میں نہیں آتی تھی، یہ واقعہ ہے بلیوں نے مایوس ہو کر خلافت ہاؤس کی اقامت ترک کر دی تھی، لیکن شوکت صاحب کی شادمانی کوئی چھین نہ سکا۔ دال روٹی اس

شوق سے اور تعریفیں کر کر کے کھاتے تھے جیسے من وسلویٰ کھا رہے ہوں، دن میں دو مرتبہ غسل کرنا اور لباس تبدیل کرنا ان کا معمول تھا وہ کہا کرتے تھے، غربت کسی آدمی کو میلا کچیلا رہنے پر مجبور نہیں کرتی، پیسے نہ ہوں تو آدمی خود اپنے کپڑے روز دھو سکتا ہے، لباس پھٹا ہو تو پیوند لگا سکتا ہے اور اجلا رہ سکتا ہے اور خود ان کا عمل بھی یہی تھا، ان کا جامۂ تار تار کئی مرتبہ میں نے پیوند لگتے اور رفو ہوتے دیکھا ہے، دوستوں کی جیب پر ڈاکہ مارنے میں وہ کمال رکھتے تھے، لوگ خلافت کو چندہ دیتے کتراتے تھے لیکن شوکت صاحب کا مطالبہ رد کر دیں یہ نہیں ہو سکتا تھا، بابائے اردو (مولوی عبدالحق) ایک مرتبہ اورنگ آباد سے انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے کا پروگرام لے کر حیدرآباد تشریف لائے، ان کی وجاہت ان کا اثر و رسوخ، چھوٹوں اور بڑوں پر ان کا دباؤ، اس امر کا غماز تھا کہ جھولی بھر کر واپس آئیں گے، لیکن حیدرآباد پہنچے تو شوکت صاحب کی صورت میں ایک قدآور حریف موجود تھا اور قبل اس کے کہ مولوی صاحب حرف مطلب زبان پر لائیں، یہ حریف بے درنگ مشترک دوستوں کی جیبیں خالی کرا لیتا تھا، بڑی بے بسی کے ساتھ سید ہاشمی فرید آبادی کو مولوی صاحب نے شوکت صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا، یہ شخص تو ڈاکہ ڈال رہا ہے، میں کیا کروں؟ لیکن ڈاکے کی رقمیں اس ڈاکو نے کبھی اپنی ذات پر یا اپنے اہل وعیال پر خرچ نہیں کیں، اس کا ایک بیٹا کلکتے کی ایک مل میں کام کرتا رہا اور یہ رقمیں لا لا کر خلافت فنڈ میں جمع کرتا رہا، فقر و فاقے کے اس عالم میں بھی علی گڑھ کا کوئی دوست آجائے، علی گڑھ کی کوئی ٹیم آجائے، علی گڑھ کا کوئی وفد آجائے تو خلافت ہاؤس ان مہمانوں کے لیے وقف، قرض لے لے کر خاطر تواضع کا حق ادا کیا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ سے خلافت ہاؤس منتقل ہو گئی ہے، چٹکلے، لطیفے، پرانی داستانیں، دوستوں کا ذکر، یار طرحی

تذکرہ، محفل آرائیوں کی داستان، بلاسے ان مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد فاقہ مستی رنگ لائے، لیکن اب تو آرام سے گزرتی ہے۔

بمبئی کے محلوں سے کچھ ہندوں بچے غائب ہوئے، پروپگنڈا یہ شروع ہوا کہ یہ حرکت پٹھانوں کی ہے، داور کا علاقہ، ہندو آبادی پر مشتمل ہے، وہاں پٹھانوں پر قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور بہت جلد ہندو مسلم فساد نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شہر کے دوسرے محلوں میں تو مسلمان کلہ بکلہ لڑ رہے تھے، لیکن داور میں پٹھانوں کی حالت بہت سقیم تھی، پٹھان کسی ایک جگہ آباد نہیں تھے، مختلف چالوں میں بکھرے ہوئے تھے اور تعداد میں بھی ہندوؤں سے بہت کم تھے، مولانا شوکت موٹر میں بیٹھے سیدھے داور جا پہنچے، جہاں خشت باری اور سنگ باری ہو رہی تھی، نعرے لگ رہے تھے، پٹھان اپنی اپنی کوٹھریوں اور کمروں میں محبوس تھے جو اکا دکا کہیں نظر آجاتا قتل کر دیا جاتا، پولیس افسر نے شوکت صاحب سے کہا، حالات نازک ہیں آپ آبادی میں تشریف نہ لے جائیے، ہم سے جو کچھ ہو رہا ہے کر رہے ہیں۔

شوکت صاحب نے جواب دیا۔

"تم تو کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہو، میں اپنی زندگی کا خود ذمہ دار ہوں ہٹو راستہ دے دو مجھے"

وہ مرعوب ہو کر ہٹ گیا، شوکت صاحب کو دیکھ کر بلوائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے، لیکن انھوں نے ذرا پرواہ نہیں کی، ایک ایک چال میں، ایک ایک گھر میں پہنچے اور خلافت کے رفاکاروں کی مدد سے داور کے تمام پٹھانوں کو جن کی تعداد کئی سو تھی نرغہ سے نکالا، خلافت ہاؤس میں ٹھیرایا اور جب تک حالات معمول پر نہ آگئے ان کی مہمانداری کرتے رہے، خود چاہے فاقہ کر لیا ہو، مگر کسی مہمان کو بھوکا سو جانے دیا ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا۔

فری پریس جنرل کے بدزبان اور شورہ پشت ایڈیٹر سدانند نے شوکت صاحب پر الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کو شہ دے کر ہندوؤں کو قتل کر رہے ہیں اور جس ٹرک میں خلافت کے رضاکار گشت کر رہے تھے، اس سے خون آلود چھرے برآمد ہوئے ہیں، بمبئی کارپوریشن نے ایک مجلس صلح طلب کی، شوکت صاحب کو بھی مدعو کیا، انھوں نے صلح و سلام کی حمایت میں ایک دل نشین تقریر کی، بمبئی کے ارب پتی سرمایہ دار اور ساہوکار سر پرشوتم داس ٹھاکر داس اٹھے، انھوں نے فری پریس کی خبر حاضرین کو سنائی، پھر کہا لوگ باتیں اتحاد اور صلح کی کرتے ہیں، لیکن موقع پاتے ہی، چاقو اور چھرے کا استعمال بھی شروع کر دیتے ہیں، شوکت صاحب نے پرشوتم داس ٹھاکر داس کو ترکی بہ ترکی جواب دیا اور خفا ہو کر اجلاس سے چلے آئے، دوسرے روز سدانند پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کر دیا۔

مقدمہ دائر کر کے شوکت صاحب نے بمبئی کے سارے پریس کو اپنا مخالف بنا لیا۔ سدانند بڑا با اثر آدمی تھا، ہندو سرمایہ داروں نے مقدمے کو ناکام بنانے کے لیے تجوریوں کے منہ کھول دیئے، شہر کے بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر سدانند کا مقدمہ مفت لڑنے کو میدان میں آ گئے، سدانند اس مقدمے سے بہت خوش ہوا، ایک تو اس لیے کہ اسے یقین تھا شوکت صاحب جیت نہیں سکتے، دوسرے اس لیے کہ ازالہ حیثیت کا ثابت کرنا، اور کڑے سے کڑے اور ناگفتہ بہ جرم کے لیے تیار رہنا ایک بڑے لیڈر کے بس کی چیز نہیں، کیونکہ وہ شیش محل میں رہتا ہے۔

شوکت صاحب کے دوستوں نے رائے دی کہ مقدمہ واپس لے لیا جائے، مسلم سرمایہ دار سدانند سے اتنے خائف تھے کہ انھوں نے ذرا مدد نہیں کی، لیکن شوکت صاحب کو خدا پر بھروسہ تھا، وہ اڑے رہے مقدمہ چلا اور بڑے شان سے لڑا گیا، شوکت صاحب نے سدانند کو جرم کا ایسا نپا تلا جواب دیا کہ وہ خود مجرم

ہو کر رہ گیا اس کے دونوں مفروضے غلط ثابت ہوئے، چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے جس روز فیصلہ سنایا، عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن فیصلہ سدانند کے خلاف تھا، اسے جرمانے کی سزا ہوئی، فیصلہ اتنا زبردست تھا کہ سدانند اپیل کرنے کی ہمت نہ کر سکا جرمانہ ادا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

مولانا شوکت علی نے جس خلوص کے ساتھ مسلم لیگ کی خدمت کی، اسے ہر دلعزیز اور مقبول بنایا، اسے عوامی جماعت کے درجے تک پہنچا دیا، اس کے قائداعظم بھی معترف تھے۔ قائداعظم ہمیشہ نازک مواقع پر، ان کے تعاون اور رفاقت کے جویا ہوئے، ان کی لڑکی نے جب ایک غیر مسلم سے شادی کرنے کا فیصلہ نا سمجھی تربیت کے باعث کیا، تو قائداعظم نے شوکت صاحب کو یاد کیا اور باچشم پرنم ان سے اصرار کیا کہ وہ کسی ایسے قابل اعتماد مسلمان کا بندوبست کر دیں جو انگریزی اچھی جانتا اور اسلام کی خوبیوں سے لڑکی کو واقف کر سکے، کیونکہ وہ اسلام سے دور ہوتی جا رہی ہے، یہ بات قائداعظم کسی اور کے علم میں نہیں لائے سوائے شوکت صاحب کے، انھیں امید تھی کہ لڑکی راہ راست پر آجائے گی اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ اس کے بارے میں چہ می گوئیاں ہوں اور بات پھیلے۔

شوکت صاحب نے وعدہ کر لیا، لیکن چند ہی روز گزرے تھے کہ اس نے اپنے پارسی خاندان کے ایک مل اونر سے شادی کر لی، اس حادثے کا قائداعظم پر جو اثر ہوا وہ تو ہونا ہی چاہیے تھا، لیکن شوکت صاحب کا یہ حال تھا کہ آنسو نہیں تھمتے تھے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ شوکت صاحب کو روتے دیکھا۔

انڈیا ایکٹ کے ماتحت ۱۹۳۵ء میں جب صوبائی مجالس قانون ساز کا انتخاب ہوا تو جھانسی کے الیکشن کو کانگریس نے اور لیگ نے معیار بنا لیا تھا، جواہر لال نے بار بار اعلان کیا ہم مسلم لیگ کو شکست دے کر رہیں گے، قائداعظم نے یہ مہم شوکت صاحب

کے سپرد کی، وہ بمبئی سے سیدھے جھانسی روانہ ہو گئے، کانگریس کے امیدوار کے لیے رفیع احمد قدوائی مرحوم کی سرکردگی میں جمعیتہ علمائے ہند، مسلم مجلس، مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے اکابر اور کارکنوں کا قافلہ تھا، کانگریس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی، مسلم لیگ اب ابھرنا شروع ہوئی تھی اور قائداعظم عام چندے کے خلاف تھے، لہٰذا لیگ کے ذرائع اور وسائل حد درجہ محدود تھے، مگر شوکت صاحب کی جواں ہمتی اور اولوالعزمی نے یہ مرحلہ آسانی کے ساتھ طے کر لیا، گو ان کی جان پر بن گئی، گرمی کا موسم تھا، وہ بھی بندیل کھنڈ کی گرمی، جہاں آفتاب سوا نیزے پر آجاتا ہے۔ ووٹروں کو منظم اور متحد کرنے کے لیے دور دراز کے دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ بھی ضروری تھا، سواری کہیں یکہ، کہیں تانگہ، کہیں بیل گاڑی جو مل جائے، چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک روز کئی میل کا سفر بیل گاڑی پر کرنا پڑا۔

شوکت صاحب لحیم شحیم بھی اور ذیابیطس کے مریض بھی، سفر ختم ہوا تو خون کا پیشاب کئی مرتبہ آیا، لیکن ان کے عزم و ہمت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی زندہ دلی، وہی بذلہ سنجی، وہی حاضر جوابی، وہی جوش و خروش، لوگوں نے اصرار کیا "آج آپ آرام کر لیجئے، جلسہ کل سہی" لیکن شوکت صاحب کہاں ماننے والے تھے، اسی حالت میں جلسہ گاہ تک پہنچے اور ایک نعد دار تقریر کی، کانگریس یہاں عرصے سے کام کر رہی تھی اور بہت پر امید تھی، لیکن شوکت صاحب نے پانسہ پلٹ دیا، یہ معرکے کا انتخاب تھا، اس میں مسلم لیگ کو فتح مبین حاصل ہوئی اور کانگریس کو شکست فاش

نومبر ۱۹۳۸ء کے آخری ہفتے میں برنکائیٹس کا ان پر شدید حملہ ہوا، اس حالت میں مسلم لیگ کے کام سے آسام کے شہر شیلانگ کے دورے کا پروگرام بنایا یکم دسمبر تاریخ روانگی طے پائی۔ ۲۸ نومبر کو بیگم محمد علی کی قیام گاہ کے صحن میں لیٹے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے کہ تمازت ناگوار محسوس ہوئی، جا کر اپنے کمرے میں

لیٹا رہے، ذرا دیر کے بعد بیگم محمد علی کچھ دریافت کرنے کمرے میں پہنچیں تو شوکت صاحب اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

سبک بار مردم سبک تر روند!

چند دیگر مسلمان اکابر و مشاہیر

یہ باب بھی چند ایسی ہستیوں کے تعارف پر مشتمل ہے، جن کا ذکر تحریک مسلم لیگ اور قیام پاکستان کے سلسلے میں آتا رہے گا، ان حضرات کا مختصر تعارف ضروری ہے اور مختصر طور پر ان کے پس منظر پر روشنی ڈالنی بھی لازمی ہے، بغیر اس کے پاکستان کے سلسلے میں، ان کی روش، کردار اور اقدام و عمل کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکے گا۔ اس باب میں جن لوگوں کا ذکر کروں گا، ان میں چند اہم شخصیتیں شامل ہیں، اس فہرست کو عملاً میں نے مختصر رکھا ہے۔ ان حضرات کا ذکر نہیں کیا ہے جن کے بارے میں عام طور پر لوگ اب بھی بہت کچھ جانتے ہیں، اور ان کے پس منظر سے بھی پورے طور پر واقف ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عالم دین تھے، اور شیخ طریقت بھی، انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا، ایک ادیب، ایک خطیب، ایک صحافی، ایک رہنما، ایک مجتہد اور ایک فقیہ کی حیثیت سے، ان کی دعوت کا آغاز، اسلام سے ہوا اور اختتام قومیت متحدہ پر۔ انھوں نے مسلمانوں کے سامنے جو منہاج رکھا وہ قرآن و حدیث کا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک وطن پرست اور قوم پرور کی حیثیت سے نمایاں ہوتے گئے۔ شروع میں

ان کی تلقین یہ تھی کہ ہمیں نہ انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیئے، نہ ہندوؤں کا شریک سیاست ہونا چاہیئے۔ سیادت اور سرافرازی ہمارا حصہ ہے، اور "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" لیکن آخر میں ان کی تذکیر یہ رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کو اس دیس میں ایک اقلیت کی حیثیت قبول کر لینی چاہیئے اور ہندوؤں کی عالی ظرفی پر بھروسہ کرتے ہوئے یقین کر لینا چاہیئے کہ ان کے "حقوق" پامال نہیں ہوں گے وہ نمودار اس طرح ہوئے تھے کہ "اسلام" کے سوا کچھ کہتے تھے نہ سنتے تھے، لیکن، اس نمود کا عروج یہ تھا کہ وہ "فرقہ پرستی" سے بیزار ہو گئے تھے، چنانچہ انھوں نے موتی لال نہرو کی نوزائیدہ اور خود ساختہ جماعت میں شریک ہو کر مجلس خلافت سے استعفا دے دیا۔ کیونکہ اس انجمن کی شرط یہ تھی کہ اس کا ممبر کسی فرقہ وارانہ جماعت کا رکن نہیں ہو سکتا، منظر عام پر وہ اس طرح ابھرے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رجز ان کی زبان پر تھا لیکن سی آر داس کی رفاقت، گاندھی کی نیاز مندی، موتی لال کی دوستی، اور جواہر سے تعلق خاطر نے انھیں اتنا بدل دیا کہ وہ مسلمانوں کے حق خود ارادیت تک کے قائل نہیں تھے۔ منصۂ شہود پر وہ اس طرح جلوہ گر ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا عرش الٰہی سے براہ راست ان کا تعلق قائم ہے، لیکن آخکار ایک دن وہ بھی آ گیا کہ مسلمانوں کی قومی انفرادیت کے تحفظ کا مطالبہ ان کی چین پیشانی کا سبب بن گیا۔ آخر میں جب جواہر لال، پٹیل، اور گاندھی تک چار و ناچار تقسیم ہند یعنی مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لینے پر مجبور ہو گئے، مولانا تب بھی اپنے ان رفیقوں سے ذہنی طور پر متفق نہ ہو سکے، جیسا کہ انھوں نے تفصیل سے اپنی آخری کتاب "India wins freedom" میں لکھا ہے۔ تحریک پاکستان کے راستے میں جو سنگ گراں حائل تھے۔ ان میں ایک مولانا بھی تھے، انھوں نے ہر موقع پر پاکستان کے تصور اور مطالبے کی مخالفت کی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو:۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا محمد علی کے رفیق

زنداں رہ چکے تھے، امرتسر کے رہنے والے تھے، جلیان والا باغ کے حادثے میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ تحریک خلافت کے زعیم بنے پھر جب کانگریس ایک خاموش تماشائی کی طرح، مہاسبھا کی فتنہ آرائیوں، اور شدھی و سنگھٹن کی تحریکوں سے بے تعلق رہی تو یہ میدان میں آئے اور جواب آں غزل کے طور پر انھوں نے تحریک تنظیم" کی بنیاد ڈالی جو بہت مقبول ہوئی، ۱۹۲۶ء میں یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے، لیکن ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے حامی بنے، پھر سے کانگریس میں شریک ہو گئے اور آخری وقت تک اپنے غیر فرقہ وارانہ مسلک پر قائم رہے۔ پاکستان کی تائید ایک لمحے کے لیے بھی نہیں کی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہ "سیف الملت والدین" کہلاتے تھے۔

یا وہ دور آیا کہ:-

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو، اب ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کچھ عرصہ ہوا انتقال فرما چکے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں

ڈاکٹر کچلو ہی کی صف کے ایک بزرگ مولانا ظفر علی خاں تھے، "سیف الملت والدین" کے مقابلے میں یہ "ظفر الملت والدین" تھے۔ سیاست میں حصہ لے کر اور سیاسی زعیم بن کر انھوں نے اردو زبان کو بہت نقصان پہنچایا، شاعری ان کی کنیز تھی، وہ جو غالب نے کہا ہے:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے!

وہ ظفر علی خاں کے لیے حقیقت تھی، اتنا اچھا، اتنا بڑا اور اس غضب کا برجستہ گو شاعر شاید ہی کوئی گزرا ہو کلام میں زور بھی اثر بھی، غزل میں منفرد، نعت میں اپنی مثال آپ، قصیدے کے امام، ہجو اور مدح دونوں کے مرد میدان، قوافی ہاتھ باندھے

کھڑے رہتے تھے، اکبر الہ آبادی کے بعد سنگین زمین اور سخت و مشکل قوافی کا اتنا کامیاب شاعر کوئی نہیں گزرا۔ یہی کیفیت نثر کی تھی۔ انشا پردازی میں اپنے طرز کے موجد اور خاتم، نہایت کامیاب صحافی، بے مثل مترجم، انگریزی سے کئی کتابیں اردو میں منتقل کیں، ترجمہ اصل تصنیف پر غالب۔

لیکن سیاست کے شوق نے ان بے پناہ صلاحیتوں سے اردو زبان کو پورے طور پر بہرہ ور نہ ہونے دیا، کانگریس، خلافت، تنظیم، احرار، کئی تحریکوں میں زور شور سے حصّہ لیا۔ جس تحریک میں شریک ہوئے اسے حیات تازہ عطا کی، کئی تحریکوں اور تنظیموں کے موجد اور بانی بھی تھے، بار بار جیل گئے۔ بار بار اپنے اخبار "زمیندار" کی ضمانتیں ضبط کرائیں لیکن کسی تحریک میں جم کر استقلال کے ساتھ شریک نہ رہ سکے، البتہ مسلم لیگ میں جب شریک ہوئے تو مرتے دم تک اس سے وابستہ رہے، پاکستان کی تائید و حمایت میں آخر وقت تک دل و جان سے حصّہ لیتے رہے۔ مولانا شوکت علی کے ساتھ کئی مرتبہ اس سلسلے میں سارے ملک کا دورہ کیا اور کئی معرکے سر کیے۔

مولانا حسین احمدؒ مولانا مفتی کفایت اللہ، اور مولانا احمد سعید دھلوی۔ جمیعتہ العلمائے ہند کے رکن رکین تھے۔ اس جماعت کے قیام، تاسیس اور استحکام میں مجلس خلافت اور علی برادران کا بڑا حصّہ تھا، اصولاً عقیدۃً یہ جماعت یعنی یہ حضرات ہندوؤں سے یعنی کفر سے موالات کر سکتے تھے نہ تعاون، نہ اشتراک، اور ایک عرصے تک اسی مسلک پر گامزن بھی رہے۔ نہرو رپورٹ تک یہ کانگریس کے سخت مخالف تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے دسمبر ۱۹۲۸ء میں۔ ہالیڈے پارک (پھر محمد علی پارک) کلکتہ میں مولانا حسین احمد نے نہرو رپورٹ کے خلاف جو تقریر خلافت کے سالانہ اجلاس میں کی تھی وہ نہرو رپورٹ کے خلاف کم، اور ہندوؤں کے خلاف

زیادہ تھی، اور فاصی اشتعال انگیز بھی تھی، پھر جنوری ۱۹۲۹ء کے آغاز میں سر آغا خان کی زیر صدارت جو "مسلم کانفرنس" دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس میں مفتی کفایت اللہ صاحب نہرو رپورٹ اور کانگریس کے خلاف پیش پیش تھے، نہرو رپورٹ کے خلاف جو تجویز پیش ہوئی تھی اس کے پرجوش موید مولانا ہی تھے، لیکن بعد میں اندرونی طور پر کچھ واقعات وحالات پیش آئے جن کی تفصیل اپنے وقت پر آئے گی۔ کہ یہ حضرات کانگریس کے نقیب، اور علم بردار بن گئے۔ تحریک پاکستان کے خلاف، کانگریس نے جو مستقل مورچہ قائم کیا تھا اس کے انچارج یہی تھے

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف افسوس وہ دل ربا ادائیں!!

آصف علی مسٹر آصف علی دہلی کے بیرسٹر تھے، تحریک خلافت میں انھوں نے حصہ لیا اور جیل گئے۔ اردو کے خوش نوا شاعر بھی تھے، بنگال کی ایک خاتون ارونا دیوی سے انھوں نے سول میرج کرلی تھی۔ جیل سے رہائی کے بعد یہ قومی تحریک سے الگ ہوگئے۔ بے تعلقی اتنی بڑھی کہ اندور کے مظلوم مسلمانوں کا مقدمہ لڑنے جب اندور گئے تو اپنی گراں قدر فیس اور اپنے منشی کا محنتانہ پہلے وصول کرلیا۔

لیکن ڈاکٹر انصاری نے جب داخلۂ کونسل کی تحریک شروع کی تو یہ دوبارہ میدان میں آئے اور اس مرتبہ خلافت کے بجائے کانگریس میں شریک ہوگئے، کانگریس نے مرکزی اسمبلی کے لیے انھیں کھڑا کیا، مہاسبھا نے اپنا امیدوار ان کے مقابلے میں پیش کیا وہ جیت گیا۔ یہ ہار گئے، لیکن کانگریس سے ان کی وفاداری غیر متزلزل رہی مولانا محمد علی کے دل میں یہ خیال راسخ ہوگیا تھا۔ اور بعض ثقہ لوگ اس کی تائید بھی کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ انگریزوں کے مخبر بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں۔ اس طرف اشارے بھی کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے یہ واقعہ ہو، لیکن

یہ بالکل آغاز کار کے زمانے کا واقعہ ہوسکتا ہے، کانگریس میں یہ بڑی دیانت اور وفاداری کے ساتھ شریک رہے اور جیل کی سزائیں بھی کاٹیں، ۱۹۴۶ء میں جواہر لال نہرو جب شیخ عبداللہ کی حمایت کرتے ہوئے کشمیر گئے، تو آصف صاحب بھی ان کے ساتھ تھے، اور دونوں ساتھ ساتھ گرفتار ہوئے، ظاہر ہے ان کا وزن جو کچھ بھی تھا پاکستان کے خلاف ہی صرف ہوا، اور آخر وقت تک اپنی روش پر قائم رہے، ذاتی طور پر شریف، وضع دار اور خوش مذاق آدمی تھے۔

ڈاکٹر سید محمود ڈاکٹر سید محمود خلافت کی تحریک کے زمانے میں ابھرے عرصۂ دراز تک خلافت مرکزیہ کے سکریٹری جنرل رہے رفتہ رفتہ قوم پروری کی طرف مائل ہوئے، اور پھر اس مسلک میں اتنے آگے نکل گئے کہ اپنے محسنوں، دوستوں اور معماروں سے بغاوت کرکے کانگریس کے ہو رہے۔ کانگریس نے کافی قدر افزائی کی، جنرل سکریٹری بنالیا۔ پھر جب کانگریس نے توڑ پھوڑ کی تحریک شروع کردی تو پوری ورکنگ کمیٹی گرفتار کرلی گئی اکثر لوگ احمد نگر کے قلعے میں نظر بند کیے گئے۔ انہی میں یہ بھی تھے، وہاں سے قبل از وقت جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔۔۔ رہا ہوئے، گاندھی جی کی سفارش پر جواہر لال نہرو نے انھیں مرکزی کابینہ میں شریک کرلیا۔ کچھ عرصے بعد جب نئی کابینہ بنی تو اس میں ان کا نام نہیں آیا۔ انھوں نے بھی پاکستان کی شدید و سخت مخالفت کی، لیکن اب بھارت کے مسلمانوں کی تنظیم کرنے کی فکر میں ہیں اور کانگریس کے معتوب خصوصی ہیں۔

بنگال کے مسلم رہنماؤں میں، سر عبدالعلیم غزنوی، سر عبدالرحیم، سر فضل الحق خواجہ ناظم الدین اور سہروردی خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

تحریک پاکستان کے زمانے میں سر غزنوی کانگریس کے ہتھے چڑھ گئے، سر عبدالرحیم مرکزی اسمبلی کے صدر تھے، لیکن دل سے پاکستان کے حامی تھے۔

فضل الحق مسٹر فضل الحق نے کئی مرتبہ اپنا مسلک بدلا۔ لیکن ہر حالت میں وہ "شیر بنگال" رہے، وہ بڑے دلیر، سچے محب وطن اور مخلص آدمی تھے، بنگال کا گورنر سر جان اینڈرسن ان کا سخت مخالف تھا۔ ۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخاب میں، جو انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہو رہا تھا اور جس کی رو سے صوبوں کو اندرونی خود مختاری مل رہی تھی، فضل الحق بھی اپنی عوامی محبوبیت اور مقبولیت کے بل پر، اپنی جماعت کو لے کر میدان میں اترے، میرے سامنے بمبئی میں فضل الحق نے ایک مرتبہ برسبیل گفتگو، حاجی نور محمد احمد سے کہا:-

"سر جان اینڈرسن کہا کرتا تھا، فضل الحق گورنمنٹ ہاؤس میں قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن اسی نے مجھے تشکیل وزارت کی دعوت دی، اور میرا "پریمیر" ہونا مجبوراً اسے گوارا کرنا پڑا!"

اس زمانے میں صوبے کے وزیر اعلیٰ "چیف منسٹر" نہیں کہلاتے تھے بلکہ "پریمیر" کہلاتے تھے۔

فضل الحق مسلم لیگ میں شریک ہوئے، اس کے لیے بڑا کام کیا، لیکن طبیعت میں ذرا تلوّن تھا، اس لیے، بعض دفعہ بہک جاتے تھے، لیکن پاکستان کی مخالفت انھوں نے کبھی نہیں کی، بلکہ تائید ہی کرتے رہے، یا زیادہ خفا ہوئے تو خاموش رہے۔ لاہور اجلاس میں پاکستان کی تجویز انہی نے مارچ ۱۹۴۰ء میں پیش کی تھی۔

خواجہ ناظم الدین خواجہ ناظم الدین پر شرافت، اصول پروری، دیانت، راستبازی اور وفاداری ختم تھی، وہ صحیح معنی میں مرد مومن تھے، ایک زمانہ تھا کہ بنگال کے ہوم ممبر (منسٹر) تھے انگریز گورنر کی ناک کے بال تھے، اقدام و عمل میں اتنے بے باک کہ دہشت پسندوں کی تحریک کا قلع قمع کر دیا۔ لیکن اپنی جماعت سے اور اپنی قوم سے کبھی نہیں لڑے، ہر طرح کا نقصان اٹھا لیا، مگر اس جادۂ صواب سے منحرف نہیں ہوئے، بنگال کے وزیر اعظم بھی رہے، مرکزی اسمبلی کے

ممبر اور قائداعظم کے دست راست بھی، اپنی زندگی پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی
اس اصول پر کسی مفاہمت کے لیے تیار نہ تھے، کیمبل جانسن نے "لارڈ ماؤنٹ بیٹن
کے عہد" کی جو یادداشت لکھی ہے، اس میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ مسلم لیگ کے بڑے
بڑے لیڈروں میں سے اکثر پاکستان سے متعلق کسی "متبادل تجویز" پر غور کرنے کو
تیار تھے، لیکن ایک شخص ایسا تھا جو پاکستان سے کم پر کسی طرح راضی نہیں ہو سکتا
تھا، نہ پاکستان کے سوا کچھ ماننے پر تیار تھا، ! ۔ قائداعظم ان کے تدبر اور دیانت
کے حد درجہ مداح و معترف تھے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد، مشرقی پاکستان
کا وزیر اعظم انھوں نے خواجہ صاحب ہی کو بنایا، یہی بات شہید سہروردی کو ناگوار
گزری جس نے ضرورت سے زیادہ طول کھینچا۔

حسین شہید سہروردی

شہید سہروردی نے پاکستان کی تشکیل و قیام
میں جو کردار ادا کیا وہ قطعاً غیر فانی ہے۔ یہ
انہی کا تدبر تھا کہ انھوں نے بنگال کے ہندو سرمایہ دار کانگریسیوں کا ڈٹ کر اور
کامیاب مقابلہ کیا۔ پھر لارڈ ویول نے بدعہدی کر کے جب مسلم لیگ اور قائداعظم
کو نظر انداز کرتے ہوئے، مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی جواہر لال کو دعوت
دی اور مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا، تو وہ شہید سہروردی تھے، جنھوں نے
اعلان کر دیا تھا کہ بنگال مرکز سے بغاوت کر دے گا، اور اس وقت تک اس سے
تعاون نہیں کرے گا جب تک مسلم لیگ کو اس کا واقعی حصہ نہ مل جائے گا پھر
کابینہ وفد کے سلسلے میں، جب یہ بات نظر آنے لگی کہ برطانیہ کی حکومت لارڈ ایٹلی
کی ہندو نوازی کے باعث پاکستان کو قائم نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے یا کرنے والی ہے، تو
قائداعظم نے دہلی میں (اپریل ۱۹۴۶ء) ایک کنونشن طلب کیا، اس کنونشن میں
پاکستان کا مطالبہ زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا اور قائداعظم سمیت تمام مسلم لیگی

کارکنوں اور لیڈروں نے عہد کیا کہ وہ حصول پاکستان کے لیے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے، اس کنونشن میں سہروردی ہی نے (جہاں تک مجھے یاد ہے) یہ تجویز پیش کی تھی، اور ایسی معرکہ آرا تقریر کی تھی کہ وائسریگل لاج کے در و دیوار ہل گئے تھے،

اصفہانی بنگال کے رہنماؤں میں مسٹر اصفہانی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا وہ بہت بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار تھے سیاست سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، لیکن قائداعظم سے والہانہ تعلق خاطر کے سبب وہ میدان میں آئے اور انھوں نے مسلم لیگ کی تنظیم و استحکام کے سلسلے میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

قائداعظم پر جب ایک خاکسار نے قاتلانہ حملہ کیا اور وہ صحیح سلامت بچ گئے تو اصفہانی صاحب نے کئی لاکھ روپے صرف کر کے "جناح ہسپتال" کی بنیاد ڈالی پاکستان کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

پنجاب کے چند اکابر سر خضر حیات خاں نے سر سکندر حیات کے انتقال کے بعد قائداعظم کو یقین دلایا تھا کہ اگر انھیں پنجاب کا وزیر اعظم رہنے دیا گیا تو وہ مسلم لیگ ہائی کمان کے تابع فرمان رہیں گے اور اس کے احکام و ہدایات سے سرمو انحراف نہیں کریں گے۔ قائداعظم نے یہ یقین دہانی قبول کر لی۔ لیکن بہت جلد سر خضر حیات اپنے عہد سے پھر گئے۔ سر چھوٹو رام کی رفاقت میں مسلم لیگ کے خلاف ایک موچہ قائم کر لیا۔ اور آخر میں تو یہ کمال کیا کہ جب پاکستان کے سوال پر ۱۹۴۶ء میں مجالس آئین ساز کا انتخاب ہوا تو اپنی پارٹی کی شکست فاش اور مسلم لیگ کی فتح مبین کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد کی رہنمائی میں کانگریسی، مہاسبھائی اور مخالف پاکستان عناصر کے ساتھ ساز باز کر کے چند ووٹوں کی اکثریت حاصل کر لی۔ اور گویا کانگریسی وزیر بن گئے، اور مسلم لیگ کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔ نواب

ممدوٹ، مسٹر دولتانہ، میاں افتخار الدین، شوکت حیات خان، بیگم شاہنواز، مس جمناز شاہنواز اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کو جیل تک بھیج دیا۔ استعفا اس وقت دیا جب معلوم ہو گیا کہ اب پاکستان بن کر رہے گا۔ (۷ مارچ ۱۹۴۷ء)

پنجاب میں نواب ممدوٹ، دولتانہ، شوکت حیات خان، میاں امیر الدین اور ان کے رفقاء نے جس بے جگری سے خضر حیات کے استبداد کا، ہندو سامراج کا اور انگریز گورنر کی قہرمانیت کا مقابلہ کیا، وہ تاریخ پاکستان کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ جس کا ذکر اپنے موقع پر تفصیل سے آئے گا۔ ہر طرح کے ناسازگار حالات کے باوجود پوری عزیمت و استقامت کے ساتھ انھوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کا پرچم بلند رکھا۔

ایک طرف خضر حیات خان کا استبداد کارفرما تھا دوسری طرف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا جوہر خطابت، مظہر علی اظہر کا جوشِ کار اور علامہ مشرقی کا بیلچہ مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف جہاد میں مصروف تھا۔ مسلم اکثریت کے صوبے میں تحریک پاکستان کی زبوں حالی ایک بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے اس کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

سندھ کے چند اکابر

سندھ پہلا صوبہ تھا جس نے پاکستان کی تجویز اسمبلی میں منظور کی۔ اس صوبے کی قیادت اگرچہ کمزور تھی لیکن یہاں کے عوام نے غیر معمولی جوش و خروش سے پاکستان کی تائید و حمایت کی مسلم لیگ کانفرنس کے سلسلے میں قائداعظم کا جو پہلا جلوس کراچی میں نکلا تھا، اس کی مثال سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی۔ جی ایم سید، ایوب کھوڑو، سر غلام حسین، ہدایت اللہ، پیر الٰہی بخش، علی محمد راشدی، میراں محمد شاہ وغیرہ نے شروع شروع میں مسلم لیگ کے لیے تن من دھن سے کام کیا، اور پورے ملک میں ایک شاندار مثال قائم کر دی، لیکن ان میں سے کئی لوگ پاکستان سے زیادہ اپنے دلدادہ

تھے۔ چنانچہ یہ مرغ بادنما کی طرح اپنا مسلک بھی بدل لیا کرتے تھے، حد یہ ہے کہ بعض نے پاکستان کے سب سے بڑے مخالف اللہ بخش مرحوم سے تعاون میں گریز نہیں کیا اور آخری انتخاب (۱۹۴۶ء) کے موقع پر تو انھوں نے اتنی ذہانت کا ثبوت دیا کہ عین اس وقت مسلم لیگ اور قائداعظم کا ساتھ چھوڑ کر اعلان بغاوت کیا جب مسلم لیگ کے لیے نئے امیدوار کھڑے کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔

لیکن ناانصافی ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے کہ حاجی سید عبداللہ ہارون مرحوم کی قائداعظم اور پاکستان سے غیر متزلزل عقیدت میں کبھی فرق نہیں آیا، وہ اپنی دولت، اپنی توانائی اور اپنی قوت اس مقدس مقصد اور کام کے لیے عزیمت و استقامت کے ساتھ صرف کرتے رہے ان کا مسلک ایک لمحے کے لیے بھی کبھی نہیں بدلا، اپنے اصول پر وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔

اسی طرح قیام پاکستان تک ایوب کھوڑو کی وفاداری بھی قائداعظم، پاکستان اور مسلم لیگ سے غیر متزلزل رہی۔

اکابر سرحد

صوبہ سرحد مسلم اکثریت کا صوبہ تھا، لیکن وہاں عبدالغفار خان کی سرپرستی میں کانگریسی وزارت قائم تھی اور ڈاکٹر خان صاحب وزیراعظم تھے، کانگریسی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے یہ دونوں بھائی ہر ممکن کوشش عمل میں لاتے رہے، نوبت یہاں بھی سول نافرمانی اور جیل تک پہنچی اس حکومت کو فتح کرنے، مسلم لیگ کو ہر دلعزیز بنانے اور بالآخر مسلم لیگی حکومت قائم کرنے میں مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور بھولا بھائی ڈیسائی کے دست راست خان عبدالقیوم خان کا بڑا حصہ تھا، انھوں نے نہایت نازک مرحلے پر کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور مسلم لیگ میں شرکت کر کے اپنی ساری توانائیاں اور سرگرمیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔

صوبۂ متحدہ کے چند اکابر

یوپی میں راجہ امیر محمد خان والی محمود آباد نے جواب کراچی میں قلندرانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، مسلم لیگ کو مضبوط و مستحکم بنانے میں وہ سب کچھ کیا، جو کیا جا سکتا ہے، انھوں نے جیب خاص سے لاکھوں روپیہ صرف کیا، بڑے سے بڑے خطرات کا مقابلہ کیا، اپنی ریاست کی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں کیا، لیکن تحریک پاکستان قائداعظم اور مسلم لیگ سے اپنی وابستگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ بے اندیشہ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ راجہ صاحب کا شمار نظریہ پاکستان کے بانیوں میں ہے، اسی طرح مولانا جمال میاں فرنگی محلی کی آتش نوائی، خلوص اور جوش اور جذبۂ کار نے بھی یوپی کے عوام کو پاکستان کا والہ و شیدا بنا دیا۔

چودھری خلیق الزماں، اگرچہ اپنی زندگی کے ہر دور میں مخالفت کے شکار رہے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ جس جماعت میں بھی رہے، صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتے رہے، خلافت میں وہ علی برادران کے دوست اور ساتھی، کانگریس میں رہ کر گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال اور مولانا آزاد کی معیت میں بیٹھنے والے مسلم لیگ میں ان کے مقام کا یہ عالم تھا کہ لیگ کی جتنی تجویزیں ہیں ان کا نوے فیصد حصہ خلیق صاحب ہی کی طبع رسا اور زور قلم کا نتیجہ ہے، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی تجویز بجنسہ یا بہ ترمیم خفیف سبجیکٹس کمیٹی سے منظور ہو کر، اجلاس عام میں پیش ہو کر پاس نہ ہو جاتی ہو قائداعظم تک اس میں شاذ و نادر ہی ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

بمبئی کے چند اکابر

پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں جن صوبوں نے غیر معمولی غیر فانی اور ناقابل فراموش حصہ لیا ہے ان میں سر فہرست بمبئی ہے، سر کریم بھائی ابراہیم (بیرونٹ) سر علی محمد خاں، مولانا عرفان،

حاجی نور محمد احمد، مسٹر چندریگر، حاجی ابوبکر بیگ محمد (اور ان کے صاحبزادگان) مسٹر اے کے سومار، الایاسیمہ مرزا اختر حسین، حبیب سیمہ (حبیب بینک لمیٹڈ کے بانی) اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف مال و زر کا ڈھیر قائداعظم کے قدموں کے سامنے کر دیا، بلکہ عملی طور پر بھی مسلم لیگ، اس کے پیام، اس کی تحریک، اس کے مقصد اور اس کے قائد کے لیے شب و روز ایک کر دیے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے مسلم لیگ جتنی مضبوط بمبئی میں تھی شاید کسی صوبے میں نہیں تھی۔

نوآموز و نووارد کارکنوں میں مسٹر حسن لے شیخ اور پیرزادہ شریف الدین اٹرنی جنرل کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، ان لوگوں کو زیادہ کام کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کا خلوص اور ان کا جوش تحسین و توصیف کا سزاوار ضرور ہے۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب میں بمبئی اسمبلی کی تمام نشستوں پر مسلم لیگ قابض ہو گئی۔ حلف اٹھانے کی رسم انجام دی گئی تو مسلمان ممبروں نے اردو میں حلف اٹھایا۔

کانگریس کو ایک مسلم وزیر کی ضرورت تھی، اس نے مسلم لیگ کی صف میں انتشار پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، کئی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر وزارت کی پیش کش کی لیکن کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔

سر کریم بھائی (بیرونٹ) بمبئی کے کروڑپتی لوگوں میں تھے، انھوں نے لب سمندر جوہو پر ایک شاندار بنگلا تعمیر کرایا اور اس کا نام "پاکستان" رکھا۔

پاکستان بننے سے پہلے جوہو پر سیر و تفریح کے لیے آنے والے ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی، اور انگریز اس "شاندار" پاکستان کو دیکھ کر غرق حیرت ہو جاتے تھے اور منٹوں کھڑے اسے دیکھا کرتے تھے پاکستان بننے کے بعد سر کریم بھائی کی کروڑوں روپے کی جائداد دست اعدا میں پہنچ گئی اور وہ ایک غریب الوطن کی حیثیت سے ایک چھوٹے

سے مکان میں کچھ عرصے بعد مرض قلب کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

نواب حمید اللہ خاں

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے، نواب حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کا ذکر کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں، وہ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے ایک بڑی ریاست کے خود مختار فرماں روا تھے، "چیمبر آف پرنسز" کے کئی بار صدر منتخب ہوئے اور تقسیم ہند کے وقت بھی اس منصب پر فائز تھے وہ بہت بڑے مدبر، بہت بڑے سیاست داں اور بہت اچھے مسلمان تھے، پاکستان کی تحریک سے اپنے آپ کو الگ نہ رکھ سکے گاندھی جی سے ایک کاغذ پر انھوں نے یہ لکھوا کر قائد اعظم کو پیش کیا تھا کہ

"مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے!"

جس پر جواہر لال، پٹیل اور دوسرے لوگوں نے گاندھی جی کے خلاف بغاوت کر دی اور مجبور ہو کر دوسرے روز انھیں اپنا اس تحریر سے دست بردار ہونا پڑا نواب صاحب کے تدبر کا یہ شاہکار تھا اور یہ اتنا بڑا المیہ تھا کانگریس کے لیے جسے کانگریسی رہنما اب تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔

نواب صاحب کی پاکستان دوستی اور گاندھی جی سے یہ تحریر حاصل کر لینے کا انتقام بھی لیا گیا۔ بھلا پٹیل جیسا شخص اتنے بڑے جرم کو پاکستان بننے کے بعد کیسے معاف کر سکتا تھا۔ اس انتقام کی روداد کہانی وائسرائے کے مشیر دستوری اور وزارت داخلہ کے سیکریٹری مسٹر وی پی مینن کی نہایت دلچسپ اور معرکۃ الآرا کتاب

THE STORY OF THE INTEGRATION THE INDIAN STATES

میں دیکھا جا سکتا ہے جسے قلم بند کرتے ہوئے مینن جیسا سنگ دل بھی گویا رو پڑا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ

بھوپال کے ساتھ مجھے حیدر آباد بھی یاد آ رہا ہے۔

حیدرآباد نے ایک سپوت پیدا کیا جو سارے ملک پر بھاری تھا، بہادر یار جنگ!

یہ امیر ابن امیر اور رئیس ابن رئیس، فکرزن و فرزند اور املاک و جاگیر سے بے پرواہ ہو کر قائداعظم کا نقیب بن گیا۔ اس کی زبان سے پھول جھڑتے اور انگارے برستے تھے۔ اس کے نطق و کلام میں ہمالیہ کی عظمت اور سمندر کی ہیبت تھی۔ اس کی خطابت صحیح معنوں میں سحر تھی، یہ دلوں کو گرماتا تھا، یہ مردوں میں زندگی کا شرارہ پیدا کر دیتا تھا۔ یہ کم حوصلہ لوگوں میں جرأت و شجاعت اور مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو پاکستان اس قدر جلد نہ بن سکتا۔ یہ نہ ہوتا تو پاکستان کی تحریک اتنی جلدی عوامی تحریک نہ بن جاتی۔ یہ اسی کی خطابت کا کرشمہ تھا کہ پاکستان کا نعرہ ہر دل کی دھڑکن بن گیا۔ یہ اسی کے خلوص کی کارفرمائی تھی کہ حیدرآباد پاکستان کا قلعہ بن گیا۔ اور اسی کا دبدبہ تھا کہ سکندر حیات جیسا شخص بھی اس کے سامنے سر جھکاتا تھا۔ اور یہ کشش صرف اسی میں تھی کہ قائداعظم جیسا غیر جذباتی آدمی بھی اسے عزیزوں کی طرح چاہتا اور مانتا تھا۔

بہار اور سی پی کے اکابر بہار کے صوبے میں عزیز ملت سید عبدالعزیز، آنریبل حسین امام (کونسل آف اسٹیٹ کے صدر) اور دوسرے اکابر نے جو کام کیا، اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی، اسی طرح سی پی کے سید عبدالرؤف اور نواب صدیق علی خاں کے کارنامے بھی۔ خاص طور پر ودیا مندر اسکیم کے خلاف تحریک سول نافرمانی۔ ایک نہ بھولنے والی کہانی ہے۔

تعارف اور پس منظر کی کہانی ختم ہوئی، اب اصل موضوع شروع ہوتا ہے۔

چند ہندو اکابر کا تذکرہ

پاکستان کی تاریخ اس وقت تک پورے طور پر واضح اور ذہن نشین نہیں ہو سکتی، جب تک ہندو رہنماؤں کی سیرت، کردار اور شخصیت کا ایک مختصر سا مرقع نظر کے سامنے نہ ہو، یہی وہ اصحاب عزیمت ہیں، جن کا نعرہ تھا "ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور" پاکستان کی تحریک مختلف مرحلوں سے گزری ہے، اور کوئی مرحلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ہندو رہنماؤں کی اعلانیہ یا در پردہ فتنہ سامانیاں سنگ گراں بن کر حائل نہ ہوئی ہوں، لہٰذا اصل موضوع پر آنے سے پہلے چند سربرآوردہ ہندو رہنماؤں کا تعارف ضروری ہے، اس لیے کہ آئندہ چل کر جو تاریخی بحث آئے گی اس میں وقتاً فوقتاً ان اصحاب کے اسمائے گرامی ضرور آئیں گے، اور وہ موقع ان کا پس منظر بیان کرنے کا نہ ہوگا۔ کیونکہ تاریخی سلسلہ بحث میں جو نام آتے ہیں ان کے افکار و خیالات اور آراء و نظریات ہی پر بحث کی جاتی ہے، ان کی شخصیت، ذاتیات اور اخلاق و کردار پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ اگر ایسا کیا جائے تو خلطِ مبحث پیدا ہو جائے گا اور اصل موضوع گفتگو تشنہ رہ جائے گا۔

مہاتما گاندھی ہندو رہنماؤں کے سلسلے میں گاندھی جی کا نام کسی طرح

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ صحیح معنیٰ میں مجموعۂ اضداد تھے۔ روحانی پیشوا بھی تھے اور سیاسی رہنما بھی، داعی بھی، مبلغ بھی۔ انگریزی کے بہترین انشا پرداز، صاحبِ طرز ادیب اور بلند پایہ صحافی، ساتھ ہی ساتھ "اندرونی آواز" کے احکام و ہدایت کی روشنی میں رہبری کرنے کے باعث اپنے وقت کے رشی اور منی بھی،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گاندھی جی نے اپنی روح اور اپنے اخلاق کی تعمیر کے سلسلے میں غیر معمولی مشقتیں برداشت کی تھیں۔ ریاضت اور مجاہدے نے ان کی روح میں جلا پیدا کر دی تھی، اور ان کے اخلاق کو پاکیزہ بنا دیا تھا۔ وہ سچ بولتے تھے اور سچ پر قائم رہتے تھے، وہ حق کے لیے جان دے دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اصول کی خاطر وہ رائے عامہ کی نہ صرف مخالفت برداشت کر لیتے تھے، بلکہ اس کے خلاف صف آرا بھی ہو جاتے تھے، آزادی کی تڑپ جتنی ان میں تھی ان کے کسی ساتھی میں نہ تھی، چھوت چھات کے وہ دل سے مخالف تھے۔ مذہبی تعصب کا اظہار اگر کرتے تھے تو بہت زیادہ محتاط اور نپے تلے الفاظ میں۔

ان کی سیاست کی بنیاد مذہب پر تھی، لہٰذا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جسے وہ مذہبی اعتبار سے پرکھ نہ لیتے ہوں۔ لیکن جس مذہب کے وہ پیرو تھے وہ تنگ نظری میں اپنا جواب نہیں رکھتا، اپنی ذات سے وہ لاکھ وسیع النظر ہوں، لیکن مذہب سے جو تنگ نظری اور عصبیت وراثت میں انھیں ملی تھی، اس سے دامن کشا ہونا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ چیز ان کے لیے بعض وقت بڑی دشواریاں پیدا کر دیتی تھی، لیکن وہ انھیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مذہب کا معاملہ جب آجاتا تھا تو وہ صرف ہندو تھے۔

۱۹۲۴ء میں، کوہاٹ کے ہندو اور مسلمان دست و گریباں ہو گئے۔ اس فساد نے خوں ریزی کی صورت اختیار کر لی۔ گاندھی جی اور مولانا شوکت علی کانگریس کی

طرف سے تحقیق احوال کے لیے موقع واردات پر بھیجے گئے۔ حکومت نے دونوں رہنماؤں کا داخلہ کوہاٹ میں ممنوع قرار دے دیا۔ لہٰذا کوہاٹ سے باہر یہ تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی، گاندھی جی کے پاس ہندو فریاد لے کر پہنچے اور شوکت صاحب کے پاس مسلمان، شوکت صاحب نے مناسب یہ سمجھا کہ حالات ذرا سازگار ہوں تو واقعات کی چھان بین کے بعد رپورٹ مرتب کی جائے، لیکن گاندھی جی انتظار نہ کر سکے انھوں نے ایک بیان شائع کر کے ہندوؤں کی مظلومیت اور مسلمانوں کی دراز دستی کا اعلان کر دیا، اس یک طرفہ بیان پر شوکت صاحب نے شدید اختلاف اور احتجاج کا اظہار کیا، حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ گاندھی جی بقول خود شوکت صاحب کی جیب میں رہا کرتے تھے۔

وجے لکشمی پنڈت کی شادی جب سید حسین سے ہوئی تو گاندھی جی تلملا گئے اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک دونوں میں تفرقہ نہ کرا دیا، اور بڑودہ کے عباس طیب جی کی صاحبزادی ریحانہ کی شادی جب شنکر لال بینکر کے بھتیجے سے ہوئی تو مبارک باد کا تار میاں بیوی کو بھیجا۔ اُس تلملاہٹ اور اس مبارک باد میں کوئی منطقی ربط نہیں پایا جاتا، اگر ایک مسلمان سے ایک ہندو لڑکی کا نکاح غیر پسندیدہ تھا تو ایک ہندو سے ایک مسلمان لڑکی کا رشتہ ازدواج بھی ناپسندیدہ ہونا چاہیے تھا۔

بلگام کانگریس کے صدر گاندھی جی تھے، (۱۹۲۴ء) اس زمانے میں ہندو مسلم فسادات ملک گیر پیمانے پر ہو رہے تھے، وجہ نزاع مسجد کے سامنے باجا بجانا اور گاؤکشی کرنا اور اسی طرح کے چند مسائل تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران نے ایک تجویز مصالحت گاندھی جی کے سامنے کانگریس کے اجلاس سے منظور کرانے کے لیے رکھی، جس میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کا حق ہر قوم کے لیے تسلیم کیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی علی برادران کو بلایا

اور فرمایا:-

"میں تو اس تجویز کے سلسلے میں معاون بننے کے بجائے رکاوٹ بن جاؤں گا، کیونکہ کوئی ہندو گاؤکشی کے حق کو تسلیم نہیں کر سکتا، لہٰذا تجویز میں حسب مقدور ترمیم ضروری ہے۔!"

چنانچہ تجویز کھٹائی میں پڑ گئی۔

اچھوتوں کو جداگانہ حق انتخاب جب گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ملا تو گاندھی جی نے "مرن برت" رکھ لیا اور اس وقت تک فاقہ شکنی پر آمادہ نہیں ہوئے جب تک اچھوت اس حق سے محروم نہیں ہو گئے، کیونکہ اس طرح ہندو قوم گاندھی جی کے نقطۂ نظر سے انتشار کا شکار ہو جاتی اور اس کے لیے وہ کسی طرح بھی تیار نہیں تھے۔

ہندو مسلم فسادات کے زمانے میں ایک موقع پر تو انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ

"ہندو بزدل ہیں اور مسلمان دنگئی"

جس پر علی برادران جیسے گاندھی جی کے شیدائی تک احتجاج پر مجبور ہو گئے، خالص سیاسی اعتبار سے بھی گاندھی جی "ہندو" ہی تھے وہ ایک لمحے کے لیے بھی مسلمانوں کی ملّی انفرادیت تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوئے، اُن کا انگریزوں سے صاف اور واضح مطالبہ یہ تھا کہ اقلیتوں کا مسئلہ ہم پر چھوڑ دو، ہم ان سے بھگت لیں گے، اور جب انگریزوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تو انھوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی، جو اُن کے بنیادی مذہبی عقیدے، عدم تشدد کے بالکل منافی تھی، اس تحریک کا مقصد بقول قائداعظم انگریزوں کو دہشت زدہ کر کے۔ ہندو اکثریت کے ہاتھ میں نظام حکومت دیدینا تھا، اس مطالبے کا اس کا سوا کوئی

اور مقصد نہیں تھا کہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں غیر مشروط طور پر ہندوؤں کی غلامی قبول کرلیں، اس مطالبے کے تسلیم نہ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ توڑ پھوڑ، آتش انگیزی اور قتل و غارت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

گاندھی جی اگر خالص سیاستداں ہوتے تو اور بات تھی، خالص مذہبی رہنما ہوتے تو بھی اور بات تھی، لیکن سیاست اور مذہب کی آمیزش نے مصلحت پسند بھی بنا دیا تھا، ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو حکومت برطانیہ نے جمہوریت کے حفظ و بقا کے نام پر کانگریس کا تعاون چاہا گاندھی جی نے صاف اعلان کر دیا کہ میں عدم تشدد پر تیار ہوں مساعی جنگ میں کانگریس کو شرکت کا مشورہ کیسے دے سکتا ہوں، لارڈ لن لتھگو وائسرائے ہند نے اس مسئلے پر جب ان سے گفتگو کی تو انھیں بھی یہی جواب دیا گاندھی جی نے اندازہ لگایا کہ اس وقت انگریز دباؤ میں آجائیں گے تو اس شرط پر کہ ہندوستان کو آزادی دینے کا پختہ یقین دلا دیا جائے اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کانگریس کے حوالے کر دی جائے تو وہ کانگریس کو مساعی جنگ میں شریک ہونے سے نہیں روکیں گے گویا اپنے مذہبی عقیدے کا عدم تشدد بدل دیں گے۔ گاندھی جی کی اس روش پر ان کے مداح اور ممدوح مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی آخری کتاب میں سخت حیرت اور تعجب کا اظہار کیا ہے۔

گاندھی جی ایک انسان تھے اور ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں وہ اپنے کسی حریف کو برداشت نہ کر سکتے تھے، نہ معاف کر سکتے تھے۔ سوبا ش چندر بوس کو انھوں نے کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا، وہ تاریخ سیاست ہند کا حیرت انگیز باب ہے۔ حالانکہ قابلیت اور قربانی کے اعتبار سے بوس کانگریس کے صف اول کے لیڈروں میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن یہی بوس، جب روپوش

ہو کر ہندوستان سے نکلے اور جرمنی پھر جاپان گئے اور وہاں آزاد ہند فوج کی بنیاد ڈالی، اور گاندھی جی کو یہ دیکھ کر کہ یہ فوج آسام تک پہنچ گئی ہے یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان پر انگریز قابض نہیں رہ سکتے جاپان کی مدد سے بوس ایک فاتح اور کشور کی حیثیت سے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھے گا تو بوس کے قصیدے پڑھنے لگے اور اس شاعرانہ مبالغے سے کہ جواہر لال نہرو کے لیے ان قصائد کا سننا اشتعال کا سبب بن گیا، جواہر لال بوس کے سخت مخالف تھے اس لیے کہ بوس سے سب سے زیادہ خطرہ انہی کو تھا چنانچہ انھوں نے بوس کو مرنے کے بعد بھی معاف نہیں کیا، بلکہ ان کی لڑکی کو، جو آسٹریا کی ایک جرمن خاتون کے بطن سے تھی ہندوستان میں پاؤں نہیں جمانے دیئے بے چاری آئی اور واپس چلی گئی۔

جس طرح جواہر لال کے ناقابل برداشت حریف بوس تھے، اسی طرح گاندھی جی کے ناقابل برداشت حریف، قائداعظم تھے، فرق یہ تھا کہ جواہر لال کی مخالفت تلخ ہوتی تھی اور گاندھی جی کی شیریں، یہ دوسری بات ہے کہ نتائج و اثرات کے اعتبار سے یہ شیرینی زہر کا کام کرتی تھی۔

پلٹے کھانے، بات کہہ کر مکر جانے، مانی ہوئی بات کی ناقابل قبول توجیہہ کرنے، اور معاہدے کر کے، ان کے حسب دل خواہ معنی بیان کر کے انھیں ردی کا پرزہ بنا دینے میں گاندھی جی کو کمال تھا۔

پرانے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی بڑی دل جمعی اور سکون خاطر کے ساتھ الوداع کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے قطع تعلق کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

بھولا بھائی ڈیسائی کو تحریری طور پر لیاقت ڈیسائی پیکٹ کی اجازت دی جس کا مطلب یہ تھا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندو مسلم مساوات ہو گئی۔

لیکن جب اس پر لے دے ہوئی تو خود الگ ہو گئے اور ڈیسائی کو بھیڑیوں کے آگے چھوڑ دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے چارے اس غم میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

علی برادران بجا طور پر گاندھی جی کے لیے کہہ سکتے تھے۔

منم کردہ ام رستم پہلواں وگرنہ بلے بود در سبستاں

خلافت کمیٹی کے سرمائے سے، کانگریس کی ناداری کے باعث۔ گاندھی جی نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ لیکن نہرو رپورٹ کے مسئلے پر ان دونوں بھائیوں سے یوں منہ پھیر لیا جیسے کبھی کی شناسائی ہی نہیں تھی،

ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا گویا ہم سے اور تم سے میل ہی نہ تھا گویا

جو گاندھی، سرحدی گاندھی۔ عبدالغفار خاں کے صوبے کو دوسرے صوبوں کے برابر حق دینے کو کبھی تیار نہ ہوا۔ وہ پاکستان دینے پر کیسے تیار ہو جاتا؟ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی جتنی مخالفت گاندھی جی نے آخری وقت تک کی کسی نے نہیں کی، پاکستان کی مخالفت میں انھوں نے ہر چیز داؤں پر لگا دی تھی، لیکن جب تقاضائے مصلحت کے مطابق دفعتہً انھوں نے پاکستان کو تسلیم کیا تو ایک مرتبہ پھر سرحدی گاندھی کو بڑی بے مروتی سے نظر انداز، اور ان کی فریاد کو سنی ان سنی کر دیا، یہ داستان مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑے اثر انگیز انداز میں تحریر فرمائی ہے۔

موتی لال نہرو

موتی لال نہرو۔ جواہر لال کے والد۔ صحیح معنوں میں مدبر اور سیاست دان تھے، مذہبی پابندیوں پر کبھی عامل نہیں رہے علی الاعلان گوشت کھاتے اور مرغ مسلم تناول فرماتے تھے، لباس بھی مسلمانوں کا پہنتے تھے، ان کے دوستوں کی فہرست میں ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے نام تھے۔ حق دوستی ادا کرنے میں وہ یکتا تھے، انھوں نے کبھی اپنے کسی دوست

کو دودھ کا نہیں دیا۔

لیکن بلا کے ضدی، خود سر، خود رائے اور آمرانہ ذہنیت کے مالک تھے، گاندھی اگر کسی سے لچکتے تھے۔ تو وہ موتی لال ہی تھے۔ موتی لال میں وہ مذہبی تعصب تو بالکل نہیں تھا جس کی رو سے وہ مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتے ہوں لیکن وہ کبھی اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے کہ مسلمانوں کو خاص حقوق دے کر ان کی اہمیت بڑھائی جائے۔ ان کے تصور میں ایک ایسے ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں اکثریت کی حکومت ہوگی اور اقلیت اکثریت سے سرتابی نہیں کر سکے گی، ان کی مرتب کردہ نہرو رپورٹ جو درحقیقت تقسیم ہند کا سبب بنی اسی ذہنیت کی آئینہ دار تھی، اگر وہ صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح سیاسی حقوق دینے پر تیار ہو جاتے تو آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا، لیکن اپنے بہترین دوستوں اور مشیروں کی صلاح بھی نہیں مانی اور اپنی بات پر اڑے رہے، اور گاندھی جی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"اگر کانگریس کے اجلاس نے نہرو رپورٹ میں ایک لفظ کی بھی ترمیم کی تو میں کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔"

لہٰذا کانگریس کو یہ رپورٹ بلفظہٖ تسلیم کرنی پڑی، مسلمانوں کی قطع تعلقی کی قربانی دے کر۔

موتی لال جب تک زندہ رہے، کانگریس سے ہمیشہ اپنی بات منواتے رہے کانگریس میں کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ان کی رائے کے خلاف کوئی فیصلہ کر سکے۔

تحریک ترک موالات کے زمانے میں، جس کا ذکر اپنے وقت پر آئے گا، کانگریس نے مجالس آئین ساز کا بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد موتی لال نے اپنے چند دوستوں کو ہمنوا بنا کر یہ فیصلہ کیا کہ کانگریس کو مجالس آئین ساز

میں جا کر حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

گاندھی جی اس تجویز کے شدید مخالف تھے، صدر کانگریس مولانا محمد علی بھی اس تجویز کے کٹر مخالف تھے، راجگوپال اچاری، راجندر پرشاد، ولبھ بھائی پٹیل مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مظہر الحق، یہ پورا گروہ غیر تبدیلی پسند (no changers) تھا۔

لیکن موتی لال ڈٹ گئے، اور ایسی سخت روش اختیار کی کہ بقول مولانا محمد علی گاندھی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اس امر کا پورا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ کانگریس دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی، بالآخر کانگریس کے خصوصی اجلاس دہلی ستمبر ۱۹۲۳ء میں جو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا تھا، ان کی کوشش سے یہ طے پایا کہ جو لوگ مجالس آئین ساز کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کر سکتے ہیں، ان کی کانگریسیت پر اس سے کوئی زد نہیں پڑے گی۔ چنانچہ موتی لال نے مرکزی اور صوبائی اسمبلی کا انتخاب "سوراج پارٹی" کی طرف سے لڑا اور ایک معقول تعداد ممبروں کی منتخب کرالی۔

جواہر لال نہرو

جواہر لال بھی مسلم دوستی میں، موتی لال کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

لیکن جواہر لال کا ایک خاص پہلو غور طلب ہے۔

جواہر لال ذاتی طور پر، اپنے مسلمان دوستوں کے جاں نثار تھے، ان کے لیے ہر قربانی کر سکتے تھے، ان سے بالکل اپنایت کا سلوک کرتے تھے، انھیں ہندو دوستوں اور رفیقوں پر ترجیح دیتے تھے، اعظم گڑھ گئے تو کسی ہندو کے ہاں نہیں ٹھہرے دار المصنفین میں علامہ سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے مہمان بن کر دو روز تک ٹھیرے۔ لیکن جہاں تک مسلم قوم کا تعلق تھا، بلاشبہ ان کا طرز عمل معاندانہ تھا۔ انھوں نے جتنی تاریخی اور نیم تاریخی کتابیں لکھی ہیں ان سب میں نہ صرف مسلمانوں

کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے بلکہ بعض جگہ حقارت سے ان کا ذکر کیا ہے، یورپ کے بڑے بڑے اسلام دشمن بھی مسلمانوں کی علمی، ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی برتری کے قائل اور مداح و ثناخواں ہیں، لیکن جواہر کو مسلم تہذیب اور ثقافت کی علامت صرف لوٹا اور داڑھی نظر آئی، یہ تو ان کا کوئی دشمن بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ تاریخ نہیں جانتے تھے۔ تاریخ عالم پر ان کی بہت گہری اور وسیع نظر تھی، اندرا کے نام جو انھوں نے "تاریخی" خط لکھے ہیں اور جو کتابی صورت میں "باپ کے خط بیٹی کے نام" سے شائع ہو چکے ہیں وہ ان کی وسعت معلومات اور وسعت مطالعہ پہ دال ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا اور ان کی تہذیب کا جہاں ذکر آتا ہے، جواہر لال مورخ نہیں رہتے افسانہ طراز نظر آتے ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو

سر تیج بہادر سپرو کشمیری ہندو تھے، اردو زبان کے عاشق مسلم تہذیب کے شیدائی، مسلمانوں کے ثناخواں، وسیع نظر اور وسیع القلب سیاست داں، مذہبی تعصب کے شکار تھے اور یہی چیز تھی جس نے انھیں پاکستان کا مخالف بنا رکھا تھا، وہ کسی قیمت پر بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ مطالبہ پاکستان ایک حقیقت بن سکے جب تک زندہ رہے، انجمن ترقی اردو کے صدر والا قدر بھی رہے اور "اینٹی پاکستان" انجمنوں اور تحریکوں کے روح و رواں بھی، کانگریسی لیڈروں کی نظر بندی کے زمانے میں جب انھیں شبہ ہوا، کہ برطانوی حکومت کسی نہ کسی نہج سے مطالبۂ پاکستان قبول نہ کر لے تو بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں انھوں نے ایک کانفرنس منعقد کی اور ایک کئی دستوری تجویز پیش کر دی، اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ اسے بے چوں و چرا تسلیم کر لے اس تجویز میں پاکستان کی بالکل نفی کی گئی تھی، لیکن مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے انھیں از راہ ترحم خسروانہ کچھ رعایت اور حقوق عطا کر دیئے گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریک پاکستان شباب پر تھی، اور قائداعظم، مسلمانان ہند کے شاہ بے تاج تھے لہٰذا کاغذی

حدود سے آگے نہ بڑھ سکی

چند دیگر ہندو رہنما صوبائی خود مختاری کے بعد جب اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں اور انھوں نے مسلمانوں کو اور مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے، مسلمانوں کے سیاسی اور ملی شعور کو کچلنا شروع کیا، تو ان میں پیش پیش جو لوگ تھے ان میں بابو سمپورنانند، مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، پنڈت گوبند ولبھ پنت، مرارجی ڈیسائی، راوی شنکر شکلا، مسٹر پاٹل، سرت چندر بوس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض آل انڈیا حیثیت کے حامل تھے اور بعض صوبائی حیثیت رکھتے تھے، لیکن یہ کانگریسی ہونے کے باوجود ہما سبھائی ذہنیت رکھتے تھے، انھوں نے مسلمانوں کو کچلنے اور دبانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، سمپورنانند نے اردو کا جنازہ نکالا، شکلا نے اپنی کابینہ میں ایک مسلمان کو بھی شریک نہیں کیا، ٹنڈن اسمبلی کے اسپیکر ہونے کے باوجود ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے، سرت چندر بوس جوڑ توڑ اور سازش سے کام لے کر بنگال کی وزارت زیر و زبر کرنے کی جد و جہد میں آخر وقت تک مصروف رہے، مرارجی ڈیسائی بمبئی کے وزیر داخلہ تھے ان کا کارنامہ یہ تھا کہ سر کریم بھائی ابراہیم کی قیادت میں مسلمانوں کے ایک احتجاجی جلوس پر بے تکلفی کے ساتھ فائرنگ کرادی، اس پر میں نے روزنامہ خلافت میں ایک اداریہ لکھا کہ کانگریس عدم تشدد کا عقیدہ رکھتی ہے، لیکن اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اپنے سے اختلاف رکھنے والے نہتے لوگوں پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتی، اس پر ڈیسائی صاحب اتنے خفا ہوئے کہ فوراً پریس اور اخبار سے تین تین ہزار کی ضمانت طلب فرمائی۔

حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے!

ولبھ بھائی پٹیل اپنی ذات سے شعلہ و شرر تھے، لیکن میں ان کی ایک خوبی

کا مداح ہوں یہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے، جو دل میں وہی زبان پر، مسلمانوں سے خفا تھے اور اس خفگی کو ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے نہیں چھپایا، پاکستان کے مخالف تھے اور اس مخالفت میں آداب تہذیب تک سے گر گئے، لیکن مفاہمت پر تیار نہیں ہوئے، احمد آباد اور میرٹھ میں جو اشتعال انگیز تقریریں کانگریس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے کیں اور بمبئی کے اجلاس کانگریس میں جس طرح صاف الفاظ میں ڈاکٹر اشرف اور میاں افتخار الدین کو حکم دیا کہ کانگریس چھوڑ دیں اور مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں کہ ان کی جگہ کانگریس میں نہیں مسلم لیگ میں ہو سکتی ہے، وہ ان کی صاف گوئی کا شاہکار ہے۔

راجگوپال اچاری کا شمار کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں ہوتا تھا، گاندھی جی کے حد سے زیادہ معتقد اور نیاز مند، برہمن ہونے کے باوجود اپنی صاحبزادی کی شادی، گاندھی جی کے لڑکے جو "ذات" میں کہیں کم تر تھے کر دی اور برادری اور علمبرداران ہندومت کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی، راجہ جی ان لوگوں میں ہیں جو کسی بات کی معقولیت سمجھ لیں تو اس کی تائید و حمایت میں کسر نہیں اٹھا رکھتے، یہ پہلے کانگریسی لیڈر ہیں جنھوں نے کانگریس کو پبلک طور پر مشورہ دیا کہ پاکستان کا مطالبہ مان لے، ان کی اس تجویز پر سارے ملک میں کہرام مچ گیا کانگریس میں صف ماتم بچھ گئی، گاندھی جی نے ترک تعلق کر لیا، الہ آباد میں کانگریس کا جلسہ طلب کیا گیا، بمبئی سے جس ٹرین میں یہ روانہ ہوئے، اتفاق سے اس میں پٹیل صاحب بھی تھے، اور مزید اتفاق یہ کہ دونوں کا کمپارٹمنٹ ایک تھا، بمبئی سے الہ آباد تک پٹیل نے ان سے بات کرنا تو درکنار، ان کی طرف دیکھا تک نہیں، الہ آباد میں پاکستان کے خلاف کانگریس نے تجویز منظور کی اور راجہ جی کو کانگریس سے استعفا دینا پڑا۔ جسے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد نے فوراً منظور کر لیا، خود ان کی برہمی کا

یہ عالم تھا کہ انھوں نے راجہ جی سے بول چال بند کر رکھی تھی، صلح اس وقت ہوئی جب کانگریس نے پاکستان کا اصول مان لیا، اور شاید تلافی مافات کے طور پر راجہ جی کو ماؤنٹ بیٹن کے جانے کے بعد بھارت کا گورنر جنرل بھی بنا دیا لیکن دلوں میں گرہ پڑ چکی تھی آخر راجہ جی اور کانگریس میں پھر ٹھن گئی۔

مسز سروجنی نائیڈو، اگرچہ دل سے پاکستان کی مخالف تھیں لیکن چونکہ انھیں قائداعظم سے والہانہ تعلق قلب تھا اس لیے پاکستان کے خلاف انھوں نے کبھی لب کشائی نہیں کی اور اگر کچھ کہا بھی تو گول مول الفاظ میں اور قائداعظم کے خلاف تو ایک حرف بھی کبھی ان کے منہ سے نہیں نکلا۔

بابو راجندر پرشاد کانگریسی لیڈروں میں پاکستان کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے پٹیل اور جواہر لال، لیکن فرق یہ تھا کہ نہ پٹیل کی طرح منہ پھٹ تھے نہ جواہر لال کی طرح جذباتی، بات سنجیدہ انداز میں کرتے تھے، پاکستان کے موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی اور اس میں دشنام طرازی کے بجائے اصولی بحث تک گفتگو کا دائرہ محدود رکھا۔

پاکستان کے مخالفین میں جو ہندو رہنما، مہاسبھا، جن سنگھ یا دوسری جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے ان کا ذکر میں نے نہیں کیا، اس لیے کہ یہ حضرات تو اپنی فرقہ پرستی پر فخر کرتے تھے، کانگریس چونکہ حق خود ارادیت کی حامی تھی، اس لیے اس کے لیڈروں نے، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت (جس کی تعداد آٹھ کروڑ سے متجاوز تھی) کے حق خود ارادیت کے خلاف جس طرح روڑے اٹکائے سازشیں کیں، دھمکیاں دیں، حد یہ ہے کہ اپنے بدترین دشمن، انگریز، تک سے ساز باز کی ان کا مختصر سا ذکر لازمی تھا۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!

اور کوئی شبہ نہیں "کوچۂ رقیب" میں جانے کی پوری قیمت ریڈ کلف ایوارڈ اور
کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور تسلط کی صورت میں وصول کر لی!

۱۸۵۷ء سے قبل

ہندوستان پر انگریزوں کے دو صد سالہ دورِ حکومت میں مسلمانوں پر آفات و مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے، وہ تاریخ شقاوت و بربریت کا سب سے زیادہ لرزہ خیز حصّہ ہیں۔ اس باب میں یہ ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ اب تک بعض اصحابِ فکر و نظر یہ کہنے سے نہیں چوکے کہ پاکستان انگریز کا "عطیہ" ہے، گویا اس نے ہندو سے انتقام یوں لیا کہ پاکستان بنا دیا، حالانکہ امر واقعہ بالکل برعکس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے بادلِ نخواستہ پاکستان کو اس لیے گوارا کیا کہ اس سے زیادہ بہتر ترکیب مسلمانوں سے انتقام لینے کی اور ہندوؤں کو قوت اور توانائی، استحکام و دوام، اور طاقت سے بہرہ ور کرنے کی کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو آئندہ ابواب میں آئے گی۔ سر دست میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ اور ہندو کس طرح ان کی قوت بازو ثابت ہوئے، اور پاکستان کا مبہم سا تصور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہی مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد میں پیدا ہو گیا تھا۔ کوئی تصور بھی شروع میں اپنی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ ذہن و دماغ میں نہیں آیا کرتا، رفتہ رفتہ حالات و عوامل، اسے ایک مربوط، منظم و مرتب نظریے کی صورت

میں متشکل کرتے ہیں۔

ہندوستان پر مسلمانوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی، جو ہندوستان آزاد و خود مختار چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، اسے متحدہ ہندوستان کی صورت میں ایک مستقل اقلیم بنانے کا سہرا صرف مسلمانوں کے سر ہے۔ مسلمانوں کے تعصب پر، ہندو آزاری پر، اور جور و ستم پر، انگریز اور ہندو افسانہ نگار، مورخ کا قلم ہاتھ میں لے کر جو چاہیں کہیں، لیکن ان کی رواداری، شرافت اور بے تعصبی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ لاہور، دہلی، آگرہ، پٹنہ، لکھنؤ، مرشد آباد، روہیل کھنڈ، خاندیس، حیدر آباد، بھوپال اور دوسرے مقامات جو غدر سے پہلے مسلم اقتدار کا سرچشمہ، مسلم تہذیب کا مرکز اور مسلم ثقافت کا منبع تھے۔ کسی دور میں بھی مسلم اکثریت کے علاقے نہ بن سکے، مسلم حکومت کے ان سیاسی اور فوجی مراکز میں ہمیشہ غالب اکثریت ہندوؤں ہی کی رہی۔

میرے دعوے کا دوسرا ناقابل تردید ثبوت بدنام اورنگ زیب کے وہ فرامین ہیں جو اس نے ہندومت وغیرہ کو جاگیریں بخشتے ہوئے صادر کیے، اور جن کا تفصیلی ذکر کرنے پر، سر جادوناتھ سرکار جیسا بے درد مورخ بھی مجبور ہو گیا۔ نیز دربار اورنگ زیب کے ان "سول اینڈ ملٹری" منصب داروں کی فہرست ہے جن کا ذکر عہد جدید کا کوئی مورخ بھی۔ بدترین تعصب رکھنے کے باوجود۔ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ہندوؤں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ غیر مذہب کے حکمران وقت سے وفاداری میں بڑے فیاض ہیں اب اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ ایک مستقل ہندو فرقہ "ورشنیہ" کے نام سے پیدا ہو گیا، جو اس وقت تک کھا پینا حرام سمجھتا تھا

جب تک شہنشاہ عالم پناہ جھروکے سے اپنا دیدار نہ کرالیں۔ دلّی کے لال قلعے میں وہ جھروکہ اب تک موجود ہے، اور عبرت و موعظت کی نہ جانے کتنی دل دوز کہانیاں اپنے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ لیکن حکمران شخص، یا حکمران جماعت، یا حکمراں قوم اگر کمزور پڑ جائے، اگر نرغۂ اغیار میں محصور ہو جائے، اگر دشمن سے شکست کھا جائے اگر تخت و تاج سے محروم ہو جائے، تو نہ صرف ان کی وفاداری ختم ہو جاتی ہے بلکہ مخالفت اور عناد کا مظاہرہ اسی دریا دلی کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

دوسری سرشت اس قوم کی یہ ہے کہ وفاداری کا دم بھرنے کے ساتھ ساتھ در پردہ اور زمین دوز طریقے پر حکومت کے خلاف سازشوں کا بازار بھی گرم رکھتی ہے۔ بت شکنی کا اور بعض مندروں کو مسجد کی صورت میں تبدیل کر دینے کا الزام، یوں تو متعدد مسلمان فرمارواؤں پر ہندو عائد کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ بدنام محمود غزنوی، علاؤالدین خلجی اور اورنگ زیب رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب پہلو، عام طور پر مورخین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ تمام غیر مسلم مورخ۔ ہندو بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ محمود غزنوی کی فوج میں نہ صرف سپاہیوں کی معقول تعداد ہندو تھی بلکہ کئی اعلیٰ افسر بھی ہندو تھے۔ ان لوگوں کے مذہبی جذبات کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اخوت اور مساوات انسانی کی علم بردار مسلمان قوم ان کی چھوت چھات کو بھی نہ صرف گوارا کرتی تھی بلکہ ان کا مذہبی عقیدہ سمجھ کر اس کا احترام بھی کرتی تھی۔ علاءالدین خلجی واقعی اپنے وقت کا سکندر تھا۔ بلکہ سکندر سے بھی بڑھ کر، کڑہ دار آپارہ سے دفعتاً ایک چھوٹی سی فوج لے کر جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں، ٹیلوں، صحراؤں کو پار کرتا، اور عبور کرتا، قضائے مبرم بن کر جنوبی ہند جیسے دور دراز مقام کی سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم حکومت، دیوگری، پر حملہ آور ہوا، اور اسے

فتح کرلیا۔ سفاکی اس کی سرشت میں تھی، اس نے اپنے محسن چچا اور خسر جلال الدین خلجی کو جس طرح قتل کیا وہ بڑا انسانیت سوز واقعہ ہے خود اپنے لخت جگر اور ولی عہد سلطنت خضر خان کے ساتھ جو ہولناک مظالم روا رکھے ان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن س کا کوئی بدترین دشمن بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکا کہ اس نے کسی ہندو پر ظلم کیا ہو۔ جبری تبدیلی مذہب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ صرف اس نے کسی ہندو پر ظلم نہیں کیا بلکہ سرکشی اور بغاوت اور سازش کرنے والے ہندو راجاؤں، سرداروں اور امیروں کو بار بار معاف بھی کیا اور الطاف خسروانہ سے نوازا بھی۔

اورنگ زیب کے بارے میں ابھی میں بتا چکا ہوں، کہ اس کے منصب داروں میں ہندو شریک تھے۔ اس نے مندروں کو جاگیریں دیں، جیسے بنارس میں، اس کی بنائی ہوئی مسجد مندروں کے بیچوں بیچ موجود ہے اسی بنارس کے مندروں کو اس نے جاگیریں عطا کیں جو وہاں کے پجاریوں کے پاس اب تک موجود ہیں، اور ان سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوؤں سے یہ حسنِ سلوک کرنے، ہندو عبادت گاہوں کا یہ احترام کرنے، اور ہندا کابر کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے باوجود انھوں نے بت شکنی کیوں کی؟ بعض مندر کیوں ڈھائے۔؟

اس سوال کا جواب تاریخ وحقائق کی روشنی میں یہ ہے کہ انھوں نے وہی مندر ڈھائے، اور انہی مندروں کے بت توڑے جو عبادت گاہ کے بجائے سازش کا اڈہ بنے ہوئے تھے۔ جہاں بظاہر بت پرستی ہوتی تھی لیکن حقیقتاً حکومت کے خلاف خفیہ تحریکوں کے سوتے یہیں سے پھوٹتے تھے، وہ کانگڑہ کا مندر ہو یا سومنات کا ہتھرا کا ہو، یا بنارس کا صرف اسی کو نقصان پہنچایا گیا جس کے بارے میں اچھی طرح

ثابت ہو گیا کہ یہ مندر نہیں، سازش کدہ ہے، اور جو مندران تحریکوں سے جدا تھے انھیں ذرا بھی نہیں چھیڑا گیا۔

ظاہر ہے اس طرح مناذر کے تقدس کو خود ہندوؤں نے ہی پامال کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس طرح کے حادثے بھی رونما نہ ہوتے، غزنوی خلجی اور عالم گیر کے بجائے اگر ہندو فرماں روا ہوتے اور ان کے خلاف مندروں کو سازش کا گھر بنا لیا جاتا تو یقیناً وہ بھی یہی کرتے۔ مسلمان فرماں روا بھی اگر مسلمان مسجدوں سے اس طرح کا کام لیتے تو یہی کرتے۔ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال موجود ہے۔ آپ نے "مسجد ضرار" منہدم کرائی، محض اس لیے کہ منافقوں نے اسلام کے خلاف اسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ مسجد کا صرف نام، اسے منہدم ہونے سے نہیں بچا سکا۔

بہر حال یہ تھے مسلمان فرماں روا!

مگر ہندو ان کے خلاف برابر سرگرم کار رہے اور مسلم حکومت کا تختہ الٹنے کی غیر منقطع اور مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔

جس طرح افراد، اشخاص موت اور ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں، اسی طرح خاندان، گروہ اور قومیں بھی موت اور ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ افراد مر کر زندہ نہیں ہوتے، لیکن جماعتوں اور قوموں کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ رعایت رکھی ہے کہ اگر وہ اصلاح احوال کر لیں۔ تلافی مافات کریں، گزشتہ غلطیوں اور کوتاہیوں سے تائب ہوں، اور پھر ان کا اعادہ نہ کریں تو انھیں حیاتِ نو بھی عطا ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے مغل خاندان کے دن پورے ہو چکے تھے، ادبار و انحطاط نے اسے اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ ہلاکت اور بربادی کے قدم تیزی سے اس کی طرف

بڑھ رہے تھے۔ نئی نئی قومیں اور قوتیں سر اٹھا رہی تھیں، قوت حاصل کر رہی تھیں کامیابیاں حاصل کر رہی تھیں۔، مگر وہ مستِ خواب خرگوش تھے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

اس سے بڑا اور سنگین حادثہ کیا ہو سکتا ہے کہ عالم گیر جس نے دبدبے اور طنطنے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ کامل پچاس سال تک حکومت کی۔ اور ہر مخالف قوت کو کچل کر رکھ دیا۔ وہی عالم گیر جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی وفات کے صرف سترہ سال، پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے، صرف سترہ سال کے اندر اس عظیم و جلیل اور وسیع و عریض مملکت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا، ظل اللہ اور جہاں پناہ موجود رہے، لیکن بادشاہت اور سلطانی سمٹتی رہی، سکڑتی گئی، مٹتی گئی، یہاں تک کہ شاہ عالم کے دور میں دلی کے بچے بچے کی زبان پر یہ قول تھا کہ:۔

"سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم"

یعنی لال قلعے سے پالم کا وہ علاقہ جہاں آج کل بھارت کا سب سے بڑا فضائی اڈہ ہے اور اس کے بعد یہ بادشاہت صرف لال قلعے میں محصور ہو کر رہ گئی۔

انگریزوں کی آمد اور ان کی تاریخ سے متعلق مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے، اس لیے کہ یہ چیز میرے موضوع سے خارج ہے۔ جو کچھ عرض کروں گا وہ صرف یہاں واقعات میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے کے لیے ہو گا۔

انگریزوں نے جب پر پرزے پھیلائے، اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے علاقوں کو توپ و تفنگ سے زیادہ سیاست و تدبیر کے بل بوتے پر فتح کرنا شروع کیا تو ہندو پورے خلوص کے ساتھ ان کے رفیق و معاون تھے۔ کوئی مرحلہ ایسا نہیں آیا جب انھوں نے خفیہ یا اعلانیہ انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہو، اور اپنے مسلمان آقاؤں کے خلاف "تیز ترک گام زن" پر عمل نہ کیا ہو، کچھ استثنائی

مثالیں بھی ہیں۔ لیکن شاذ بنگال، بہار، اڑیسہ، اودھ، جنوبی ہند میں ارکاٹ، میسور، جس کا فرماں روا ٹیپو سلطان تھا۔ اور دوسرے علاقوں پر جس کافرادائ کے ساتھ قبضہ کیا وہ تاریخ کا ایک الم انگیز باب ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی بھی ایک جماعت اپنے ذاتی مفاد کے ماتحت ہندوؤں کی دوست اور انگریزوں کی وفادار رہی یعنی

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ　　اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

خود انگریزوں نے، ان حقائق کو تسلیم کیا ہے۔ الفنسٹن اور ایلیٹ وغیرہ کو چھوڑیئے کہ وہ تاریخ لکھنے جب بیٹھتے ہیں تو بال کی کھال نکالتے ہیں، اور فلسفہ طرازی شروع کر دیتے ہیں ان لوگوں کے ارشادات پر ایک نظر ڈالیے جو واقعات کے شاہد رہے ہیں اور جنھوں نے لکھنے سے پہلے، سب کچھ یا بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے آئی۔ سی۔ ایس طبقے کا ایک معزز، جہاں دیدہ اور تجربہ کار رکن سر ولیم ہنٹر تھا اس نے (OUR INDIAN MUSALMANS) کے نام سے ایک شرانگیز کتاب لکھی ہے۔ اور ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان اپنے عقیدۂ جہاد اور پابندیٔ اسلام کے باعث کبھی اور کسی حالت میں انگریزوں کی وفادار رعایا نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ اس کے خلاف برسرِ پیکار رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ زہر اس نے اگلا۔ اور اپنی قوم کو خوب خوب ان کے خلاف مشتعل کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے تسلیم کیا ہے کہ بنگال میں جہاں وہ متعین تھا۔ کس طرح مسلمانوں کی جاگیریں چھینی گئیں، کس طرح ان کے کھیتوں اور باغوں پر قبضہ کیا گیا کیونکہ ملازمت سرکاری کے دروازے ان پر بند کیے گئے۔ اور کس کس طرح ان کے اوقاف تک پر قبضہ کر کے غیر وقفی مدات پر ان کی آمدنی خرچ کی گئی۔ اور اس آمدنی کو جن ناجائز مدات پر خرچ کیا گیا، ان سے بھی مسلمانوں کو کلیتہً محروم رکھا گیا۔ اور ان تمام کاموں میں ہندو برابر انگریزوں کے یار وفادار بنے

رہے اور مسلم اوقاف کی آمدنی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔

ہنٹر کے علاوہ بھی دوسرے انگریزوں نے مسلمانوں پر انگریزوں کے جگر خراش مظالم کی کہانی، کسی نہ کسی سلسلۂ سخن میں صفائی اور صداقت کے ساتھ حقائق کی روشنی میں بیان کی ہے۔ مسلمان ہر چہار طرف یاس وحسرت سے دیکھتے تھے، اور کچھ نہ کر سکتے تھے سوا اس کے کہ زیر لب کہہ گزریں۔

کس کس طرح ستائے ہیں یہ بت ہمیں نظام ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

انگریز جب بنگال اور بہار و اڑیسہ میں فتوحات اور تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کیے ہوئے تھے۔ اور ہندو ان کا ساتھ دیتے رہے، اسی زمانے میں ہندوؤں کا ایک بڑا اور مضبوط طبقہ ہندوستان پر خالص ہندو حکومت اور "گریٹ مرہٹہ ایمپائر" کا خواب بھی دیکھ رہا تھا۔

چنانچہ مرہٹہ گردی کے حوادث بھی اپنی جگہ ایک مستقل داستانِ الم ہے۔ سودا کا، "شہر آشوب" اور میر تقی میر کی آبلہ پائی، اور دہلی کے ہنروروں اور فنکاروں کی رضا کارانہ جلاوطنی اور مختلف شہروں میں اقامت اسی داستان کی اشک آور کڑیاں ہیں۔

کوئی شبہ نہیں مرہٹے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے۔ اور سارے ہندوستان پر ان کی حکومت قائم ہو گئی ہوتی، ان کی قوت و شوکت کا یہ عالم تھا کہ دہلی پہنچے اور زبردستی بادشاہ ذی جاہ کے متولی بن بیٹھے۔ شاہی قلعے میں جتنا سونا ملا، جتنی چاندی دستیاب ہوئی۔ اس کے سکے ڈھلوا لیے۔ مالوے پر ان کا تسلط ہو گیا۔ گوالیار اور جھانسی کی مرہٹہ ریاستیں اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ اودھ کے زرخیز صوبے پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ اور یہاں بھی انھوں نے تاخت و تاراج کا دہشت انگیز سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ پنجاب تک بڑھتے چلے گئے، پنجاب سے آگے بڑھے اور دریائے اٹک تک پہنچ گئے۔ اس کے "مقدس" پانی کو ماتھے سے لگایا انھوں نے نئے ہندوستان

کی جو سرحد متعین کی تھی اس میں صرف سرحد کا صوبہ ہی نہیں، بلکہ افغانستان بھی شامل تھا۔ وہ بیخ و بن سے مسلمانوں کو ختم کر ڈالنا چاہتے تھے۔ حیدر آباد کے نظام الملک آصف جاہ نے اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کو روکنے کی اپنے مقدور بھر کوشش کی، ایک مرتبہ پونا کو بھی آماجگاہ تاخت و تاراج بنایا، لیکن یہ کوششیں ایک پرزور سیلاب کے لیے ریت کے بند سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ مرہٹوں نے ان تمام وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھایا جو مسلمانوں کی کمزوری کے باعث ان کے ہاتھ آگئے تھے۔ اور آتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی حوصلہ مندی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک طرف اودھ میں دوسری طرف بنگال جیسے الگ ہٹے ہوئے علاقوں پر بھی کامیاب یلغاریں کر رہے تھے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دہلی اور دوسرے مقامات پر ان کی یورش کا کیا عالم رہا ہوگا۔

مرہٹوں کی ستم ظریفیاں عجیب عجیب گل کھلاتی تھیں۔ اس جنگ سے وہ کئی فائدے اٹھانا چاہتے تھے، ایک طرف تو وہ سارے ہندوستان کو زیر نگیں کر لینا چاہتے تھے اور اس معاملے میں اتنے غیر صلح کل تھے۔ کہ راجپوت اور جاٹ جیسی قوموں کو جنگ جوئی جن کی گھٹی میں پڑی تھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مرہٹوں کا آخری لشکر جو بھاوے کی سالاری میں یہ فیصلہ کر کے یلغار کرتا ہوا نکلا تھا کہ اس مرتبہ پیشوا کے ولی عہد کو لال قلعہ میں تخت نشین کرے گا، اور جس کے جلو میں بڑے بڑے ہندو راجا اور مہاراجا شامل تھے۔ اپنے میزبان اور اپنی فوجی رسد کے سب سے بڑے پشتیبان راجا بھرت پور تک سے الجھ گیا اور اسے ایک طرح سے نظر بند کر لیا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے رائے دی تھی کہ متھرا کی عالمگیری مسجد ابھی منہدم نہ کی جائے۔ جب مرہٹہ حکومت قائم ہو جائے اور مسلم حکومت کا مکمل خاتمہ ہو جائے تب بے شک نہ صرف متھرا کی جامع مسجد بلکہ سے مندر بنا لی جائے

بلکہ سارے ملک کی مسجدیں زمین کے برابر کر دی جائیں دہلی کی جامع مسجد تک کو معاف نہ کیا جائے۔ بھاوے نے اس مشورے کو اس کی کمزوریوں پر محمول کیا اور خفا ہو گیا۔ اگر ہندو مذہب کے تحفظ اور بقا، اور اس کی حکومت کے قیام کا جذباتی معاملہ نہ ہوتا تو وہ مختلف طریقوں سے سخت نقصان پہنچا سکتا تھا۔ لیکن مذہبی جذبے کے باعث یہ کڑوا گھونٹ پی گیا۔

مذہبی اعتبار سے مرہٹے ہمیشہ آزاد خیال اور آزاد رو رہے ہیں، لیکن یہ جنگ چونکہ "مذہب" کی خاطر لڑنے نکلے تھے۔ لہٰذا دہلی سے چند منزل پہلے بھاوے نے مذہب کے نام پر ایک اور نہایت دلچسپ حرکت کی۔ پیشوا کی ایک مسلمان داشتہ کے بطن سے ایک ہندو لڑکا تھا۔ شمشیر سنگھ، بھاوے نے اس سے کہا۔ تم ایک مسلمان عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہو یہ ہمیں ناگوار ہے، بہتر یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ، اور ہمارا مذہب خراب نہ کرو، شمشیر سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن کر کیا سکتا تھا۔ تعمیل حکم کرنی پڑی۔ ممکن ہے وہ دل سے پہلے سے مسلمان ہو، ممکن ہے حالات نے اسے مسلمان بننے پر مجبور کر دیا ہو لیکن اس کی اولاد سچی اور کھری مسلمان ثابت ہوئی۔ گوالیار کے قریب کدوری باؤنی ایک چھوٹی سی ریاست ہندوستانی ریاستوں کے ختم نہ ہونے تک موجود تھی اس ریاست کے فرمانروا اسی شمشیر سنگھ کی اولاد تھے۔ انھوں نے اپنے رنگ میں اور اپنے مقدور بھر اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کی پوری کوشش کی، اور سچے اور کھرے مسلمان ثابت ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور مورخ اور صحافی سید جالب دہلوی نے جو مجسم انسائیکلوپیڈیا تھے۔ یہ واقعہ ضروری تفصیلات کے ساتھ تحریر فرمایا ہے

غرض ۱۸۵۷ء کے غدر سے پیشتر ہی سے مسلمان ہدف جور و ستم بننے لگے تھے مختلف قوتیں تھیں جو انھیں مٹانے پر متحد ہو گئی تھیں، ایک ایک کر کے سارے

زرخیز و شاداب علاقے ان کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے، پہلے فرانسیسیوں اور انگریزوں کی آویزش ہوئی اس نے کام بگاڑا، پرتگال کی ترک تازیوں نے بھی مسلمانوں کو عظیم نقصانات پہنچائے گوا وغیرہ کے علاقوں پر قابض اور متصرف ہوئے، اور سورت کی بندرگاہ کو جہاں سے مسلمانوں کے قافلے عہد مغلیہ میں حجاز جایا کرتے تھے، برباد کیا۔ مسلمانوں کو جیسی جسمانی، ذہنی اور مالی اذیتیں دیں وہ رونگٹے کھڑے کرنے والی ایک ایسی داستان ہے جسے حوالۂ قرطاس و قلم کرتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

یہ سب نتیجہ تھا دو باتوں کا:۔

ایک سب سے بڑی وجہ تو مسلمانوں کی لامرکزی تھی، جن جاگیرداروں اور وزیروں کو مغل فرماں رواؤں نے اس لیے نوازا تھا کہ نازک موقع پر حکومت کا ساتھ دیں گے اور دشمن سے جنگ کریں گے۔ وہ طالع آزمائی پر اتر آئے اور خود مختار ہو کر اپنے حدود مملکت میں توسیع کی کوشش کرنے لگے، مرکز کمزور ہوتا گیا، یہ طاقتور ہوتے گئے۔ لیکن جب مرکز پر متحدہ یلغار ہوئی تو ان کی قوت خود ان کے لیے وبال جان بن گئی، نہ یہ مرکز کی کوئی خدمت کر سکے، نہ اپنی حفاظت کر سکے، کمزور مرکز کی صورت میں زیردست علاقوں کو جب قوت حاصل ہوتی ہے تو اس کا لازمی انجام یہی ہوتا ہے۔ اور یہی ہوا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے آنے والے خطرات کو نظر کے سامنے دیکھ کر بھی کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کی یہاں تک کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا۔

اگر نجیب الدولہ کے مشورے، اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ہدایت سے احمد شاہ ابدالی کے دل میں ہمدردی نہ پیدا ہوتی اور وہ مرہٹہ ایمپائر کے خواب شیریں کو خواب پریشاں ثابت کرنے "مردے از غیب" بن کر نمودار نہ ہوا ہوتا تو بلاشبہ مسلمانوں کا وجود ختم ہو جاتا اگر وہ باقی بھی رہتے تو اچھوت بن کر۔

احمد شاہ ابدالی سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے مرہٹوں کی قوت پارہ پارہ کرنے کے بعد ہندوستان میں قیام نہیں کیا اور واپس چلا گیا۔ وہ اپنے جہاد کو لوث و اغراض سے آلودہ کرنا نہیں چاہتا تھا، حالانکہ صحیح جہاد بھی یہی تھا کہ بابر کی طرح ترک وطن کر کے یہیں کا ہو جاتا، اور نظم مملکت اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔

احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ہندوؤں سے انھیں مرہٹوں کے سوا پہلے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا، مسلمان اس جنگ میں تھک چکے تھے۔ پانی پت کی لڑائی کے تھوڑی ہی مدت کے بعد انگریزوں نے بکسر میں شجاع الدولہ، شاہ اودھ کو زبردست اور خلاف توقع شکست دی، اس شکست نے اس کی اولوالعزمی کا خاتمہ کر دیا۔ اسے عافیت اس میں نظر آئی کہ ان کے سایۂ عاطفت کو ظل ہما سمجھنے لگے، انگریزوں کو بھی اس کی دل دہی مقصود تھی، انھوں نے مناسب شرائط پر اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا، لیکن فوجی امداد کے بہانے اس کے مالیات کا معقول حصہ ہتھیا لیا، پھر شجاع الدولہ کو شہ دے کر، اور اس کی مدد کر کے روہیل کھنڈ کی سب سے زیادہ مضبوط اور اسلامی اقدار کا پاس و لحاظ کرنے والی ریاست پر حملہ کرا دیا اس جنگ میں حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے۔ رامپور کی ریاست انگریزوں کی پہلے ہی تابع فرمان تھی، نجیب آباد بھی گویا ختم ہو چکا تھا۔ اسی طرح انگریزوں نے شہنشاہ ہند بر جو اپنے قلعے میں بیٹھا ملک پر حکومت کرنے کے بجائے، تسبیح و مصلّیٰ آباد کیے ہوئے تھا اور انگریزوں کی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، بالادستی قائم کر لی، آس پاس کی دوسری ریاستیں بھی عملاً فرنگی بالادستی قبول کر چکی تھیں۔

آخر حالات یہاں تک پہنچے کہ انگریزوں نے تکلف برطرف کر کے بلا شرکت غیرے ہندوستان پر مکمل، غیر مسئول اور آمرانہ قبضے کا فیصلہ کر لیا، اس سلسلے میں الحاق و

انضمام کی پالیسی عمل میں آئی۔ جھانسی کی ریاست ضبط، اودھ کی حکومت برخاست اور بہت سی چھوٹی بڑی ریاستیں نذر زنبیل، بہادر شاہ کو متنبہ کر دیا گیا کہ جناب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اس لیے ہم آپ کا وجود گوارا کر رہے ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے خاندان کو لال قلعہ خالی کرنا پڑے گا، اور مہرولی میں اقامت اختیار کرنا ہوگی اور آپ کا ولی عہد بادشاہ کا خطاب استعمال نہیں کر سکے گا، نہ اسے کوئی دوسرے مراعات خصوصی حاصل ہوں گے۔ پنجاب پر پہلے ہی فرنگی قبضہ ہو چکا تھا۔ سکھوں کو شکست فاش دے کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے بیٹے اور ولی عہد دلیپ سنگھ کو عیسائی مذہب قبول کرنے کے باوجود حکومت واپس نہیں ملی، واجد علی شاہ مٹیا برج میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی !

مسلمانوں کے لیے ان حالات کا برداشت کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا، چنانچہ ہندوستان کو غدر کا سامنا کرنا پڑا۔ واقعات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مجبوراً ہندوؤں کی ایک جماعت کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ بلاشبہ جن میں بعض مخلص بھی تھے اور وفادار بھی ! ۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت

اسباب ونتائج

مستبد اور قاہر قومیں، جب کسی ملک کو زیر نگین کرتی ہیں، تو اپنے ذہن رسا کی مدد سے ایسے حالات پیدا کرتی ہیں کہ عوام بھڑک اٹھیں اور وہ اسے غدر یا بغاوت کا نام دے کر بربریت اور سفاکی، خون آشامی اور جور پرستی کا ایسا ہولناک مظاہرہ کریں کہ پھر کسی میں یارائے دم زدن نہ رہے، ان کی دہشت قائم ہو جائے، اور وہ بے عقل و دانش حکومت کر سکیں، انگریز بھی ایسا کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے یہ کیا بھی، لیکن ان کے راستے میں، ایک بہت بڑی اخلاقی رکاوٹ بھی تھی، !

وہ اخلاقی رکاوٹ یہ تھی کہ انھوں نے اگرچہ ہندوستان کے بہت بڑے رقبے کو زیر نگین کر لیا تھا، الحاق کی پالیسی نے بہت سی ریاستوں کا وجود بھی ختم کر دیا تھا، خود، بابر کی حکومت کا وارث اور ہندوستان کا شہنشاہ ذی جاہ ان کی مٹھی میں تھا، لیکن بہر حال

وہ اس ملک کے فاتح نہیں تھے۔

اب تک ان کی حیثیت۔ جملہ اقتدار و اختیار غیر مسئول کے باوجود۔ بادشاہ کے نام پر، اور اب کہ وہ چند لمحوں میں اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر سکتے تھے۔ اور عام طور پر ہندو ان کے پشت پناہ اور یار و مددگار تھے، وہ اس ڈھونگ کو

ختم کردینا چاہتے تھے اور اس کو ختم کرنے کی واحد تدبیر یہ تھی کہ ایسے حالات پیدا کردیں کہ عوام بھڑک جائیں، بادشاہ کا پیمانۂ صبر چھلک جائے، والیانِ ریاست اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر، شورش پسندوں کی حمایت پر آمادہ ہوجائیں اور یہ سب کچھ ہوجائے تو اپنی اس قوت کی بدولت جو تقریباً سو سال میں انھوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ جمع کر رکھی تھی ایک ایسا وار کریں کہ عوام کا حوصلہ پست ہوجائے، بادشاہ کی یا تو حرکت قلب بند ہوجائے، یا وہ دیوانہ ہوجائے، والیانِ ریاست اسی کو غنیمت سمجھیں کہ جان بچ گئی، اور اس کے بعد بلا شرکت غیرے، اس خداداد ملک پر شان اور دبدبے اور جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کریں۔

غدر سے پہلے انگریزوں نے متعدد اشتعال انگیز حرکتیں کیں، تاکہ لاوا جلد پھوٹے، انھوں نے جو کچھ کیا، انتہائی مختصر کہانی اس کی یہ ہے۔

○ ۱۸۲۷ء میں لارڈ ہرسٹ نے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"ہماری حکومت خاندان تیموری کی تابع نہیں ہے بلکہ خود ملک ہندوستان کی فرماں روا ہے!"

یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب کہ انگریز بادشاہ دہلی کی طرف سے سارے ملک کا "انتظام" بحیثیت کارندے کے کر رہے تھے۔

○ انگریزوں نے اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھاکر دین عیسوی کی تبلیغ میں سرکاری نہج پر حصہ لیا، مشنریوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی اور انھیں بیش قرار مالی امداد دی، ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں بہت سے لڑکوں کو عیسائی بنالیا اور اپنی تحویل میں لے لیا؛

○ حکومت کی شہ پاکر عیسائی مشنریوں نے زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز طرز پر جھوٹ کا طومار، ہندوستان کے مذاہب کے خلاف، اگل

خاص طور پر اسلام کے خلاف تیار کیا، اور اسے کتابچوں کی صورت میں مفت تقسیم کیا مناظرے کیے۔ اور ان میں دریدہ دہنی کا پورا پورا مظاہرہ کیا، چونکہ وہ "حکومت" تھے اس لیے ان کو ترکی بترکی جواب بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔

○ ۔ حکومت نے تبلیغ دین عیسوی کے سلسلے میں مشنریوں کی دل کھول کر مالی مدد کی کہ اسکول کھولیں، جہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی اور جبری تھی، ہسپتال بھی کھولے گئے، وہاں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

○ ۔ سرکاری ملازمت میں جو قدیم تعلیم یافتہ لوگ تھے وہ برطرف کر دیئے گئے اور نئے شرائط ملازمت میں انگریزی ایک لازمی شرط بن گئی۔

○ ۱۸۵۵ء میں پادری اے ریڈمنڈ نے کلکتے کے گورنمنٹ ہاؤس سے سرکاری ملازمین کے نام خطوط بھیجے کہ اب تار، ریل اور مواصلات کی یکسانی نے سارے ملک کو واحد بنا دیا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ تم عیسائی مذہب قبول کر کے ملک کو صحیح معنوں میں ایک بنا دو،

○ ۔ اپنے تعیشات کو پورا کرنے اور ہندوستانیوں کو بھوکا مارنے کے لیے، معافیاں ضبط کر لی گئیں، جس کا کچھ اثر ہندوؤں پر بھی پڑا، مگر مسلمان چونکہ تجارت، کاروبار، سرکاری ملازمت سے عام طور پر خود کو دور رکھتے تھے اس لیے سب سے زیادہ اثر انہی پر پڑا اور ان کی معاشی حالت حد درجہ سقیم ہو گئی لارڈ منرو، اور ڈیوک آف ولنگٹن نے بھی اس طرز عمل کو قابل اعتراض قرار دیا۔

○ ۔ پرانا بندوبست منسوخ کر کے نیا بندوبست کیا گیا جو حد درجہ سخت تھا۔ اور غریب کاشت کاروں کے لیے ناقابل برداشت تھا، اور اس سے افلاس غربت، اور فلاکت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

○ ۔ روزگار اور ملازمت کے دروازے مسلمانوں پر خاص طور سے بند کر دیے

گئے تھے۔ حتی کہ فوج میں بھی انھیں بڑی مشکل سے بھرتی کیا جاتا تھا، اس وجہ سے بھی غربت پھیلی۔ اور بے اطمینانی میں اضافہ ہوا۔

○ انگریز حکام کا طرز عمل نہ صرف عوام کے ساتھ صدر جہ نخوت اور تکبر پر مبنی تھا۔ بلکہ اشراف و اعیان تک سے وہ اس طرح ملتے تھے۔ جیسے آقا غلام سے ملتا ہے بدزبانی یاوہ گوئی اور دشنام طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

○ بادشاہ کی بے وقعتی اور بے توقیری کی۔ گو یہ بادشاہ صرف آثار قدیمہ کا ایک نمونہ تھا، لیکن اس کے آباؤ اجداد نے ایک ہزار سال تک اس ملک پر حکومت کی تھی، انگریزوں نے نہ اسے زیر کیا تھا، نہ شکست دی تھی، ملازم، غادم اور جاں نثار کی حیثیت سے اس کے خدمت گار بن کر کام کر رہے تھے، ایک خدمت گار اگر اپنے آقا کی بے وقعتی اور بے توقیری کرے تو آقا پر جو گزرے گی وہ تو خیر گزرے ہی گی۔ دوسروں پر خاص طور پر ان لوگوں پر جو اس کے ہمدرد اور اس کے باجگذار ہوں، اپنے آباؤ اجداد کے وقت سے نمک خوار چلے آ رہے ہوں کیا بیتی ہوگی؟

○ اودھ کی حکومت پر قبضہ، اور واجد علی شاہ کی جلا وطنی کے واقعات بھی، صدر جہ اشتعال انگیز ثابت ہوئے اس لیے کہ نہ اودھ کا انتظام ناقص تھا، نہ واجد علی شاہ نالائق فرماں روا تھے۔ نہ انھیں انگریزوں سے دشمنی تھی، بلکہ انہی کے حسب ایما انھوں نے حکومت سے بے تعلقی عملاً اختیار کر لی تھی۔ پھر بھی شدت غضب سے نہ بچ سکے۔

اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا

○ وہ نظام جو قاضیوں کا اور دینی امور کا جاری تھا، اور جسے جاری رہنا چاہیئے تھا، یک لخت ختم کر دیا گیا تھا جس کا قدرتی نتیجہ برہمی عام کی صورت

میں ظاہر ہوا۔

○ جو لوگ حکومت انگلشیہ کے غیر مشروط طور پر وفادار چلے آرہے تھے، وہ بھی شک و شبہ سے نہ بچ سکے، اور انھیں بھی تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، بلکہ انھی کو زیادہ بے دردی اور سنگ دلی کے ساتھ پامال کیا گیا۔

○ فوج کے سپاہیوں میں نئے کارتوس منگا کر جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان میں سور کی اور گائے کی چربی شامل ہے۔ حکم دیا گیا کہ انھیں منہ سے توڑا جائے، ظاہر ہے، یہ مداخلت فی الدین تھی۔

غرض اور اس طرح پر بہت سے واقعات جب جمع ہو گئے تو غدر شروع ہو گیا

اس غدر کے دو پہلو ہیں۔

جو غدر دلی میں شروع ہوا، وہ جلد ختم ہو گیا اور وہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہا۔ لیکن سب سے زیادہ سنگین اور عبرت انگیز سزا دلی والوں کو ملی۔ شاید اس لیے کہ یہ شہر پورے ملک کا دل تھا، یہاں سے علم اور تہذیب و ثقافت کے سوتے پھوٹتے تھے

غدر کے اختتام کے بعد ہندو اور زیادہ وفاداری اور دل جمعی کے ساتھ، انگریزوں کی غلامی پر قائم ہو گئے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت بھی کی، انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی، اگر حالات اور مصالح کا تقاضا ہوا تو عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا، یہی کچھ وہ مسلمانوں کے عہد میں بھی کرتے آئے تھے، فارسی انھوں نے جس کمال کے ساتھ حاصل کی اس کے آثار آج بھی لغات اور دوسری کتابوں کی صورت میں موجود ہیں، مسلمانوں کے زمانے میں شیروانی، پاجامہ اور ٹوپی استعمال کی تھی۔ اب کوٹ پتلون پہننے لگے مسلم تہذیب کا اثر ان کی معاشرت پر بہت زیادہ نمایاں تھا، اب فرنگی معاشرت کے سانچے میں ڈھل گئے۔ ان کے نزدیک

یہ سارا انقلاب آقا کی تبدیلی کا تھا، زید کی بجائے بکر سہی، اس تبدیلی سے وہ ناخوش نہیں تھے بلکہ تنوع کا لطف اٹھا رہے تھے۔

لیکن مسلمانوں کا معاملہ دوسرا تھا:۔

مسلمانوں نے صدیوں تک اس ملک پر جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کی تھی، اب پہلی مرتبہ انھیں غلام بننا پڑا تھا۔ وہ صرف انگریزوں ہی سے متنفر نہیں تھے انگریزی زبان، انگریزی معاشرت اور انگریزی تہذیب ہر چیز سے متنفر تھے، انگریزوں نے ہندوؤں کا کچھ نہیں چھینا تھا بلکہ الٹا انھیں کچھ، بلکہ بہت کچھ دیا تھا، مگر مسلمانوں کے ہاتھ سے انھوں نے حکومت و اقتدار کی باگ ڈور چھینی تھی، اس لیے انگریز سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سختی نہ کی گئی تو یہ ضرور سر اٹھائیں گے۔ اور نہ جانے کب قیامت بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ لہٰذا انھیں کچلنا اور ختم کر دینا ضروری تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے صاحبزادے مولوی بشیر الدین نے اپنی یگانہ اور بے مثال تاریخ "واقعات دار الحکومت دہلی" میں جو دل گداز واقعات مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لکھے ہیں انھیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

غدر کے بعد جب انگریز اس ملک کے باقاعدہ بادشاہ اور فرماں روا بن گئے تھے، چاہیئے تھا کہ شرافت کا ثبوت دیتے اور مسلمانوں کے ساتھ مراسم خسروانہ کا برتاؤ کرتے۔ لیکن انھوں نے کیا یہ کہ ان کے اوقاف ضبط کر لیے، ان کے مدرسے بند کر دیئے۔ ان کے وظائف کا سلسلہ منقطع کر دیا اور ان کی مسجدیں ڈھا دیں، (مولوی بشیر الدین نے ایک ایک مسجد کا پورا پورا مرقع کھینچ دیا ہے) ان کی خانقاہیں ویران کر دی ہیں ان کے شاہی قلعے میں ہل چلوا دیئے ہیں جامع مسجد خوش قسمت تھی کہ گرداب بلا میں آکر بچ گئی، ورنہ ایک سے ایک

خوب صورت مسجد زمین کے برابر کردی گئی، یا اس پر قبضہ کر لیا گیا اور فوج کی تحویل میں دے دیا کہ جس طرح چاہے استعمال کرے، مسلمانوں کی بڑی بڑی شاندار، رفیع المرتبت اور گراں قیمت حویلیاں، کوٹھیوں کے مول ہندوؤں کے ہاتھ نیلام کر دی گئیں، بغیر کسی وجہ اور سبب کے اہالیان دہلی کی جائدادیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے گھر کا اثاثہ تک نیلام کر دیا گیا، دلی میں ہندوؤں کی آمد و رفت اور سکونت پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی، لیکن مسلمان بغیر "پرمٹ" کے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور پرمٹ کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

جھوٹی مخبری پر، غلط اطلاعات پر شک و شبہ کی بنیاد پر بے تحاشہ قتل عام کا سلسلہ شروع کر دیا گیا انگریز خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ قتل گاہ میں جلوہ فرما ہوتی تھیں، اور مسلمانوں کو قتل ہوتے دیکھ کر ہنستی اور مسکراتی تھیں ان کے شوہر قہقہے لگاتے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ ہند میں انگریزوں کی مدح و ثنا اور قصیدہ خوانی کے باوجود لکھا ہے کہ مسلمان تباہ کر دیئے گئے، ان کے گھر ویران کر دیئے گئے۔ جو نادر اور قیمتی جانور اور پرندان کے گھروں میں پلے تھے، وہ کسمپرسی سے مر گئے۔ اعلیٰ نسل کے کبوتروں کی نسل ختم ہو گئی۔ یہ سب اس جرم میں ہو رہا تھا کہ مسلمانوں نے اس بات کا برا کیوں مانا تھا کہ ان کی برائے نام حکومت اس بے دردی سے کیوں چھین لی گئی۔

ستم ظریفیوں کا ایک سلسلہ تھا جو جاری تھا!

بہادر شاہ بہر حال بادشاہ تھے اور انگریزوں کے کارندے اور ملازم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں جو کچھ بھی اقتدار و اختیار تھا وہ بادشاہ کا عطا

کیا ہوا تھا۔ انگریزوں نے بنوک سنگین یا بزور بازو اسے حاصل نہیں کیا تھا، لیکن ان بہادر شاہ کے بیٹوں کو جرم بغاوت میں قتل کر دیا گیا۔ اور خود بہادر شاہ پر ان کے ملازموں نے "بغاوت" کا مقدمہ چلایا۔ انھیں سزا دی، اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا جہاں تقریباً فقر و فاقے کے عالم میں انھوں نے زندگی کے دن بسر کیے۔

بہادر شاہ کا وہ لاڈلا بیٹا، جواں بخت، جسے وہ ولی عہد بنانے کے درپے تھے۔ اور جس کی شادی کے موقع پر استاد ذوق اور غالب نے قصیدے کہے تھے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی، ذوق کا یہ شعر اسی قصیدے کا ہے

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو　　دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

یہ شعر جواب تھا غالب کی اس تعلّی کا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں　　دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

آج وہ جواں بخت قید کی، ذلت کی، نامرادی کی زندگی بسر کر رہا تھا، شاہی خاندان کی کئی خواتین نے ملازمت کر لی، کئی طوائف بن گئیں، کئی بے نام و نشان ہو گئیں۔ کسی بادشاہ نے کسی بادشاہ سے ایسا سلوک کا ہے کو کبھی کیا ہوگا۔

دہلی اور اودھ کے مسلم رجواڑے بھی ختم ہو گئے وہ نواب جن کے لیے کبھی غالب نے کہا تھا۔

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کر، مجھے　　تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

مر چکے تھے اور ان کا خاندان تباہ ہو چکا تھا۔

فرخ آباد کے نواب، جن کے لیے غالب نے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ کہا تھا

دیا ہے اوروں کو بھی تار سے نظر نہ لگے　　　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

فقیر کا بھیس بدل کر حجاز مقدس چلے گئے اور وہیں فقیرانہ حالت میں عروس مرگ سے ہم کنار ہو گئے۔

انڈمان یعنی کالا پانی یگانہ روزگار عالموں، ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور دانشوروں کا مرکز بن گیا، اس گروہ میں مشرق کے امام فلسفہ و منطق مولانا فضل حق خیر آبادی بھی تھے۔ یہ علما و صلحا دن بھر مزدوروں کی طرح مشقت کرتے تھے، اور رات کو ایک اندھیری کوٹھری میں آ کر پڑ رہتے تھے، ان کا جرم اس کے سوا کیا تھا کہ اپنی قوم کو غلام دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔؟

ظہیر دہلوی نے اپنی جو "خود گزشت" لکھی ہے اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان شہیدان حق و صداقت کا ذکر کیا ہے جو اپنے مذہب کے ناموس، ملت کے وقار اور قوم کی آن پر قربان ہو گئے۔

آثار الصنادید میں سر سید نے جن یکتائے روزگار افراد کا ذکر انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے ان میں سے نہ جانے کتنے پھانسی پر چڑھ گئے، یا انڈمان بھیج دیئے گئے یا سب کچھ چھین لیا گیا اور وہ بھیک مانگنے کے لیے زندہ چھوڑ دیئے گئے

خانم انگلیسی کی "در ہندوستان" کے نام سے جو کتاب ایران سے شائع ہوئی تھی اور جس میں ایک فرنگی خاتون نے غدر کے چشم دید واقعات قلم بند کیے ہیں اس کے مطالعے سے لرزہ خیز حقائق نظر کے سامنے آتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ استعمار اور سامراج کو جب غصہ آتا ہے تو وہ کتنا سنگ دل، شقی اور خون آشام بن جاتا ہے، پھر نہ وہ عورت کا احترام کرتا ہے نہ بچے کا لحاظ، نہ بوڑھے پر ترس کھاتا ہے، نہ بیمار کے ساتھ رعایت کرتا ہے۔

خود انگریز مورخین اور مبصرین نے شرم و ندامت کے ساتھ ان ننگ انسانیت

مظالم کو تسلیم کیا ہے جو غدر کے دوران میں، اور غدر کے بعد مسلمانوں پر روا رکھے گئے وہ تو کہیے مسلمان سخت جان تھے کہ بچ گئے ورنہ ان کے ختم کر دینے میں اپنی طرف سے انگریزوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

سرسید نے بڑے خلوص، سچائی اور وفاداری کے ساتھ "جواد الدولہ" "عارف جنگ" ہونے اور قلعۂ شاہی سے خاندانی تعلق کے باوجود انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ کسی لالچ سے نہیں صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے، ان کی سیرت بلند کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھیں انعام میں ایک پورا ضلع شاہ تعلقہ دیا جا رہا تھا، لیکن انھوں نے شان استغنا سے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور اسے گوارا نہیں کیا کہ ایک مسلمان کی املاک و جائداد پر قبضہ کریں۔ سرسید نہ ہوتے تو بجنور میں ایک انگریز بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ انگریزوں نے شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ ان کے کارناموں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن خود سرسید کے ساتھ اور ان کے خاندان کے ساتھ کیا گزری، کیا ان کا مکان تباہ نہیں کر ڈالا گیا اس کا ساز و سامان برباد نہیں کر دیا گیا؟ ان کی خالہ کی زندگی خطرے میں نہیں پڑ گئی؟ آگرے دربار میں جب انھوں نے انگریزوں کے توہین آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور واک آؤٹ کر گئے تو کیا جیل جاتے جاتے نہیں بچے۔

غرض غدر کی ساری تاریخ مسلمانوں کی تباہی، بربادی اور ذلت کی تاریخ ہے انگریز یہ چاہتے تھے کہ من حیث القوم مسلمانوں کو ختم کر دیں یا کم از کم انھیں اس قابل نہ رکھیں کہ وہ کبھی سر اٹھا سکیں، اور کوئی شبہ نہیں اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک وہ کامیاب ہوئے۔

انگریزوں کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کے آثار و نقوش اس سرزمین سے مٹا دیں، چنانچہ انھوں نے بڑی دریا دلی سے دہلی، اور لکھنؤ اور اودھ کے

دوسرے شہروں میں مسلمانوں کی جائدادیں اور تعلقے سکھوں اور ہندوؤں کو بخش دیے۔ بہادر شاہ کی چہیتی بیگم زینت محل کی حویلی مہاراجہ پٹیالہ کو عطا کر دی گئی جو اب تک ان کے قبضے میں ہے اسی طرح کی غلط بخشیاں دوسرے مقامات پر بھی کی گئیں۔

مسلمانوں سے دولت چھین لی گئی، گھر چھین لیے گئے، کھیت اور باغ چھین لیے گئے، فتح پور کو اس لیے مسمار کر دیا گیا کہ یہاں کے مسلمانوں نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے، وہ تمام حقوق و مراعات جو مسلمانوں کو حاصل تھے، ان سے یکسر محروم کر دیئے گئے۔ ان کی تہذیب، تمدن اور حضارت کے وہ نقوش جو تاریخی حیثیت رکھتے تھے، نہایت بے دردی سے ختم کر دیئے گئے، مسلمانوں سے چھینا ہوا مال خود انھیں کے ہاتھوں گراں قیمت پر فروخت کیا گیا۔

حضرت محل واجد علی شاہ کی رفیقۂ حیات نے آخر دم تک انگریزوں کا مقابلہ کیا، لیکن آخر کار انھیں نیپال میں جا کر پناہ لینی پڑی۔

یہ غدر خود فرنگی سامراج نے برپا کرایا تھا۔

اور اس کا جو مقصد تھا وہ پورے طور پر حاصل ہو گیا تھا!

ہندوؤں نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی تھی، سکھ، اگرچہ رنجیت سنگھ کی حکومت پر غاصبانہ قبضے کا حادثہ تازہ تھا لیکن آنکھ بند کر کے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور ان کے فتوحات کے نقیب بنے ہوئے تھے، بہرائچ (اودھ) کے علاقے میں مہاراجہ کپورتھلہ کو جو بڑا علاقہ عطا ہوا تھا وہ اسی صلے میں کہ اپنے سکھ سپاہیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے بڑی خوبی سے مسلمانوں کا شکار کھیلا تھا۔

غرض دہلی کے رجواڑے ہوں یا اودھ کے تعلقے انگریزوں نے قریب قریب سب ختم کر دیے اور مسلمانوں کا نام و نشان حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے

مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے طور پر اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ان حالات نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو حد درجہ مایوس اور دل برداشتہ کر دیا تھا بلکہ ان میں لامرکزیت پیدا کر دی تھی، ان میں انتشار پیدا کر دیا تھا وہ اس طرح تقسیم ہو گئے تھے کہ ان کے بپھر سے ابھرنے اور طاقت حاصل کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی زندگی بے کیف ہو گئی تھی، بے رنگ ہو گئی تھی، بے مقصد ہو گئی تھی، آخر وہ کس لیے زندہ رہتے، زندہ رہ کر کیا کرتے؟ اس دنیا میں ان کا وجود اب کس کام آ سکتا تھا؟ وہ خود اپنے کام بھی تو نہیں آ سکتے تھے۔

آسمان سے ہن برس سکتا تھا نہ من و سلویٰ اتر سکتا تھا۔ انگریزی سے نابلد، انگریزوں سے متنفر، جیب خالی تجارت کر نہیں سکتے تھے، ملازمت کے دروازے بند تھے، جو اثاثہ تھا وہ لٹ چکا تھا، عزت کی زندگی بسر کرنے کا اب کوئی امکان بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔

اور سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ کل تک جو قومیں ان کی باج گزار، دست نگر اور تابع فرمان تھیں آج وہ ان سے کارگاہ حیات میں بازی لے جا رہی تھیں انھیں پیچھے چھوڑ کر خود بہت آگے نکل گئی تھیں، ان کے زار و زبوں حال پر ہمدردی کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑا رہی تھیں اور ان کی تباہی و بربادی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، یہ دل خراش منظر وہ دیکھتے تھے اور ایک آہ کر کے خاموش ہو جاتے تھے، کوئی ان کا سہارا نہیں تھا، کوئی ان کا پشتیبان نہیں تھا کوئی ان کا ہمدرد اور دوست نہیں تھا، وہ زندہ تھے، لیکن یہ زندگی موت سے بدتر تھی، کاش وہ زندہ نہ ہوتے اور مر گئے ہوتے!

دو قوموں میں لڑائی ہوتی ہے ایک جیت جاتی ہے دوسری ہار جاتی ہے۔ لیکن ایسی ہار؟ کہ شکست کے بعد زندگی کا حق بھی چھین لیا جائے۔ اس کا تصور بھی

نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کرنل برن جو شہر کا فوجی گورنر بنایا گیا تھا، چنگیز اور ہلاکو سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ فوج کا غلغلہ سن کر بہت سی شریف عورتیں کنوؤں میں کود گئیں۔ بہت سے کنوئیں ان کی لاشوں سے پٹ گئے، کئی لوگوں نے خود اپنی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو تہہ تیغ کیا اور پھر تلوار لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور جان دے دی۔ لارڈ رابرٹس نے مسلمانوں کے قتل عام کا جو تماشہ دیکھا تھا، اسے دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ لکھتا ہے۔

"لاہوری دروازے سے ہم چاندنی چوک گئے تو کوئی زندہ آدمی ہمیں نظر نہیں آیا لاشوں کو کتے اور گدھ کھا رہے تھے۔"

مسٹر ٹامسن نے اپنے مشاہدات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔

"ہماری فوج جیسے ہی شہر میں داخل ہوئی تو جو کوچہ و بازار میں نظر آیا سنگین سے چھید دیا گیا۔"

نواب جھجر پر یہ الزام لگا کہ انھوں نے مٹکاف کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو پھانسی دے دی گئی، شہر کا سب سے آباد، بارونق اور شاندار محلہ "خانم بازار" پورا کا پورا خاک کا ڈھیر بنا دیا گیا۔

اودھ کے شہر بھی تباہی سے دوچار ہوئے، وہاں حضرت محل اور دوسرے لوگوں نے آزادی کی جنگ انگریزوں کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد بھی شاندار پیمانے پر جاری رکھی، اس جنگ کے سب سے بڑے ہیرو، مولوی احمد اللہ تھے، ایک عالم دین لیکن ایک جیالا سپاہی، ماہر تیغ زن، مدبر اور سیاستدان اس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے، جب تک زندہ رہا انگریز اودھ پر قابض نہ ہو سکے، آخر ایک ہندو راجہ سے سازش کر کے دھوکے سے اسے قتل کرا دیا۔ راجہ پاون کو اس کارنامے کے صلے میں ۵۰ ہزار روپے عطا ہوئے مولوی صاحب

کا سر کوتوالی کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

بہار کے صوبے میں مجاہدین کو انگریزوں نے سکھوں اور ہندو وفاداروں کی رفاقت سے شکست دی۔ پیر علی لکھنوی جماعت مجاہدین کا قائد تھا، گرفتار ہو کر آیا تو اسے پیش کش کی گئی کہ دوسرے شرکاء بغاوت کا نام بتا دے تو اس کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ اس مرد مجاہد نے جواب دیا۔

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زندگی بچانے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زندگی قربان کر دینا ہی سب سے بڑا کام ہوتا ہے، میں اپنی زندگی قربان کرنا چاہتا ہوں بچانا نہیں چاہتا۔"

پیر علی کو پھانسی دے دی گئی، مسٹر ساورکر، جو آج آخری عمر میں مسلم دشمنی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے، اپنی تاریخ میں پیر علی لکھنوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان پیمبرانہ الفاظ کے ساتھ وہ سچا محب وطن، غداری کے داغ سے اپنا اور اپنے ملک کا دامن بچا لے گیا، وہ موت کے دروازے سے ہوتا ہوا شہیدوں کے اس گروہ سے جا ملا جو غیر فانی ہوتے ہیں۔"

غلام غوث خان، رانی جھانسی کا میر آتش، اس وقت تک انگریزوں پر آگ برساتا رہا جب تک ہلاک نہ ہو گیا۔

حافظ رحمت خاں، کاپوتا، بہادر خان بھی آخر وقت تک ملکہ وکٹوریہ کے نام نہاد اعلان معافی کے بعد بھی لڑتا رہا، اور جب تک جان رہی جنگ سے منہ نہ پھیرا، نجیب الدولہ کے پوتے محمود خاں، نے جس کا نام سرسید نے "نامحمود خاں" رکھا تھا، انگریزوں سے آخر وقت تک جنگ جاری رکھی۔ یہاں تک کہ کام آگیا، بخت خاں بڑا منچلا سپاہی اور تیغ زن تھا۔ بہادر شاہ اس کے مشورے پر چلتے تو دہلی کا انجام

وہ نہ ہوتا جو ہوا، اودھ میں بھی اس نے دادِ شجاعت دی۔ انگریزوں نے تمام مجاہدین آزادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن بخت خان ان کے ہاتھ نہ آیا اپنے رفیقوں سمیت اس طرح روپوش ہوا کہ آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گیا، عظیم اللہ خاں، ذہین، اور بلا کا طرحدار آدمی تھا، بہادری اور شجاعت میں یکتا، نانا صاحب کی ساری ترک تازیاں اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ، اور اسی کے مشوروں کا حاصل تھیں، انگریزوں کو اس نے اس طرح زچ کیا کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ آخر گرفتار ہوا اور پھانسی کی سزا ملی، حضرت محل نے جنگ آزادی کے ناکام اختتام کے بعد، نیپال کے شہر کھٹمنڈو میں اقامت اختیار کر لی، انگریزوں نے گراں قدر وظیفے کی پیش کش کی اور واپس بلایا، لیکن اس نے ایک آزاد ملک سے ایک غلام ملک میں آنا پسند نہیں کیا، ہر طرح کے دکھ جھیلے اور دیارِ غیر میں دم دیا۔

بہادر شاہ کا ساتھ ہندوؤں نے دباؤ سے دیا، لیکن حضرت محل، مولوی احمد اللہ اور دوسرے مجاہدین حریت کے ساتھ انھوں نے جنگ میں جوش سے حصّہ لیا، تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں بھی دیں اور بعض آخر وقت تک ثابت قدم بھی رہے، لیکن اس سلسلے میں ایک نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ رانی جھانسی ہو، جس کا مشیر اعلیٰ غلام غوث خان تھا۔ یا نانا صاحب مرہٹہ، جس کا مرشد کامل عظیم اللہ خان تھا، یا تانتیا ٹوپے اور دوسرے ہندو، یہ سب مسلمانوں کے سکھائے ہوئے تھے، یہ مسلمانوں کا کمال تھا کہ انھوں نے بہت کافی عرصے تک انھیں ثابت قدم رکھا اور ان میں تزلزل نہیں پیدا ہونے دیا۔

بڑی بڑی ہندو ریاستیں گوالیار، اندور، جے پور، اودے پور اور جودھ پور وغیرہ سے انگریزوں کو پوری پوری مدد ملی اور بلاشبہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ دوستی کا حق ادا کر دیا۔

حاصل کلام کہ غدر نے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، اب وہ ایک "معزز شہری" بھی نہ تھے، اب وہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ انگریز ان سے غدر کا انتقام لے رہے تھے اور ہندو ان سے ان کے احسان، روادی اور حسن سلوک کا انتقام لے رہے تھے، انگریز اور ہندو چکی کے دو پاٹ تھے، جن میں وہ بری طرح پیسے جا رہے تھے، غالب نے اپنے لیے نہیں، اپنی قوم کے لیے کہا ہے اور سچ کہا ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت!
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

سَرسیّد احمد خاں

غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت

غدر کے اثرات و نتائج مابعد نے مسلمانوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، اگرچہ زندگی کی رمق ان میں باقی تھی، لیکن ایک مرگ آسا سکوت بھی چھایا ہوا تھا، خدا کی یہ وسیع سرزمین ان پر تنگ تھی، وہ ہر چہار طرف، امید و آرزو کے ساتھ دیکھتے تھے، لیکن ناکامی و نامرادی ان کا استقبال کرتی تھی۔

انگریز من حیث القوم کبھی بھی مسلمانوں سے خوش نہیں رہے، اور غدر کے حادثے نے تو ان کے عتاب اور برہمی کو اوج کمال تک پہنچا دیا تھا۔ انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو پامال کر دیا، لیکن کچلنے اور پامال کر چکنے کے باوجود ابھی تک وہ ان سے بدگمان، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں خائف تھے انھیں اندیشہ تھا۔ یہ قوم ذرا سنبھلی اور تعمیر نو کا اسے کچھ بھی موقع دیا گیا تو قیامت برپا کر دے گی۔ ان پر اس جنگ جو کی مثل صادق آتی ہے جس نے اپنے حریف کو شکست دی اور اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا، پھر اس کے گلے اور جبڑے پر لگاتار مکوں کی بارش شروع کر دی، لیکن حالت یہ تھی کہ مارتا جاتا تھا اور چھوٹ چھوٹ کر روتا جاتا تھا، تماشائیوں میں سے ایک نے پوچھا:

"بھئی کیا بات ہے۔ دشمن کو ہرا دیا، اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے بے تحاشہ
اسے مارے جا رہے ہو پھر یہ رونا کیسا؟"

اس نے جواب دیا۔

"جب میں اس کی چھاتی پر سے اتروں گا، تو یہ مجھے مارنا شروع کر دے گا"

انگریز، مسلمانوں کو مکمل ترین شکست دے چکنے کے بعد ان سے خائف اور خوف زدہ تھے۔ انھیں یقین تھا، یہ قوم مر نہیں سکتی، اور اگر زندہ رہی تو ان کی خیر نہیں۔

ادھر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ نیم جان ہو رہے تھے، لب گور پہنچ چکے تھے، انگریزی تعلیم نہ حاصل کی تھی، نہ حاصل کرنے پر آمادہ تھے۔ لہٰذا سرکاری ملازمت کا باب عالی ان پر بند تھا، تجارت اور سوداگری ان کی شان کے خلاف تھی، لہٰذا اس میدان میں قدم رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کھیت، باغ، زمین، تعلقے، رجواڑے، جاگیریں املاک، جائیداد، حد یہ ہے کہ رہنے کے مکان تک یا ضبط ہو چکے تھے یا نیلام کر دیے گئے تھے، وہ بھی کوڑیوں کے مول، لہٰذا گھر بیٹھے عزت اور وقار کی زندگی بسر کرنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا اور آنکھوں دیکھتے وہ حریف بے زبان - ہندو کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا، اس نے نہ صرف مخبری، جاسوسی، اور اطاعت کیشی کے سبب اپنی املاک و جائیداد کو ضبط و نیلام ہونے سے بچا لیا تھا، بلکہ اپنے سابق آقاؤں، سرپرستوں، محسنوں، دوستوں، رفیقوں - مسلمانوں کی جائیداد نیلام میں اس طرح حاصل کر لی تھی کہ چند روپے دیے اور لاکھوں کی جائیداد پر مالکانہ حق حاصل کر لیا۔ مولوی بشیر احمد نے تاریخ دارالحکومت دہلی میں، معززین شہر کی ان جائیدادوں، حویلیوں اور مکانوں کی تفصیل دی ہے جو انگریزوں نے ضبط کیں، اور ہندوؤں نے تقریباً مفت حاصل کر لیں، مولوی صاحب مرحوم نے جس کاوش اور تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس موضوع پر اتنی مکمل، مستند اور ضخیم کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی

ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ صحت اور استناد کا دامن جذبات کے ریلے میں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا ہے۔

سرسیّد کی رہنمائی

سرسید اس نازک ترین مرحلے پر خضر طریقت بن کر نمودار ہوئے۔

اگرچہ سرسید کا خاندان، لال قلعے کے منسلکین میں تھا۔ اور خود وہ بھی اس شرف میں شریک تھے اور ذاتی طور پر جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب بھی انھیں حاصل تھا، لیکن بایں ہمہ، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے۔ اور بہت اونچے منصب صدر امینی پر فائز تھے۔

یہ بات شروع ہی سے سرسید کے دل پر نقش ہو چکی تھی، یا شاید ان کی چھٹی حس نے انھیں باور کرا دیا تھا۔ کہ اب خاندان مغلیہ باقی نہیں رہ سکتا، نہ مسلمان برسر اقتدار رہ سکتے ہیں۔ انگریزوں کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ اور وہ اس دیس کے فرماں روائے مطلق بن کر رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ غدر کے زمانے میں نہ صرف انھوں نے اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ دل و جان سے انگریزوں کی مدد کی اور بہت سے انگریزوں کی جان بچائی۔ نجیب الدولہ کا پوتا محمود خان بھی پرچم بغاوت لے کر میدان میں اترا تھا۔ اور ساری خلقت اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ سرسید کو جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے۔ محمود خان نے ہر طرح سے رام کرنے کی کوشش کی، لالچ بھی دیا، دھمکی سے بھی کام نکالنا چاہا، وہ ہر چہار طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ خود ان کی زندگی بھی "اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند" کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ لیکن پورے استقلال و عزیمت کے ساتھ وہ جادۂ وفا پر استوار رہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے انگریزوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کی کتاب "تاریخ سرکشی بجنور" بغاوت ہند کے لٹریچر میں مواد اور معلومات

کے اعتبار سے یگانہ اور منفرد ہے، اگرچہ اس کا انداز بیان تلخ ہے۔ اور انگریزوں سے وفاداری میں غلو طبیعت کو گراں گزرتا ہے۔ لیکن بہر حال اپنے موضوع پر نہایت معرکہ آرا کتاب ہے اور غدر سے متعلق مصادر میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں سرسید نے جو کچھ لکھا ہے۔ بیان واقعہ میں پوری دیانت ملحوظ رکھی ہے۔ ان کے نتائج فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے بیان کردہ کسی واقعے کو غلط اور من گھڑت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مغلیہ خاندان کے خاتمے کا سرسید کو زیادہ صدمہ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر بہت پہلے سے تیار تھے۔ انگریزوں کے تسلط کا بھی انھیں غم نہیں تھا، اس لیے کہ فکری طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے "کہ دور مجنوں گزشت اب انگریز ہی اس ملک پر راج کریں گے، ان سے لڑنا، ان سے مقابلہ کرنا، مشیت ایزدی سے جنگ کرنا ہے۔ اس لیے کہ خدا کا فرمان صادر ہو چکا ہے۔ اب اس قوم کو حکومت کا موقع ملنا چاہیئے، ہندو بس تیز رفتاری سے بام عروج پر پہنچ رہے تھے اس کا بھی سرسید کو غم نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ ان کی ذہنیت سے واقف تھے کہ وہ پانی کی خاصیت رکھتی ہے جس برتن میں ڈالو وہی شکل اختیار کر لے گی، ان کا دل فرقہ وارانہ تعصب سے بھی خالی تھا ان کا خیال تھا کہ ہر قوم کو اپنا مستقبل طے کرنا اور ترقی کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، پھر اگر ہندو اپنے طور پر اپنے مستقبل کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اور ترقی کے خداداد مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد!۔

راہ کی مشکلات لیکن جو غم سرسید کی جان لیے ڈال رہا تھا وہ مسلمانوں کی زار و زبوں حالت تھی، مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا یا صحیح اس موضوع پر انھوں نے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ اپنے افکار و خیالات

کا بے خوف لومۃ لائم اظہار کیا اور وہ سب کو معلوم تھے، لیکن وہ خود بھی تو مسلمان تھے اور ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمان قوم سے ہٹ کر اپنے لیے کوئی راستہ بنائیں گے۔ مسلمان زندہ ہیں تو وہ بھی زندہ ہیں، اور اگر مسلمان نہیں تو وہ بھی نہیں۔ اب تک وہ قدرت کے پیدا کیے ہوئے حالات کے ماتحت انگریزوں کی تائید کر رہے تھے، لیکن اب مسلمانوں کی بقا اور تحفظ کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ وہ انگریزوں کا دل مسلمانوں کی طرف سے صاف کر دیں، اور مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کریں کہ اگر زندہ رہنا ہے، تو انگریزوں سے تعاون کرنا ہی پڑے گا۔ انگریزی زبان اور علوم کی تحصیل کرنی ہی پڑے گی، اپنی عظمت رفتہ کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن تھا۔

یہ بڑا کٹھن کام تھا! لیکن سرسید کی زندگی ہی کانٹوں سے دامن الجھاتے اور ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے گزری تھی، انھوں نے ایک مرد مومن کی طرح یہ کٹھن کام سرانجام دینے کا بیڑا اٹھا لیا یہ ہمت سرسید کے سوا کسی میں نہ تھی۔

سرسید نے کام کا آغاز کیا، اور طے کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنا مشن سرانجام دے کر رہیں گے،!

وہ میدان میں آئے، انھوں نے اپنی دعوت پیش کی۔

مسلمانوں کے دل اب تک غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ اب تک انگریزوں سے متنفر تھے۔ اور ان سے تعاون تو بڑی چیز ہے۔ ہاتھ ملانا بھی حرام سمجھتے تھے، لہٰذا ان کی دعوت کا جواب سب و شتم سے دیا گیا۔ ان کے خلاف دشنام طرازی کی گئی، انھیں کافر قرار دیا گیا۔ حرمین شریفین یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تک سے ان کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کیے گئے، انھیں "کرسٹان" کہا گیا۔ ان کی دعوت کا مذاق اڑایا گیا۔ کئی اخبارات صرف اس لیے جاری ہوئے کہ سرسید کے خلاف مسلسل دشنام طرازی کرتے رہیں، ان کے خلاف کتابیں لکھی گئیں۔ پمفلٹ تیار کیے گئے۔ پوسٹر شائع کیے گئے۔

جو کچھ انھوں نے نہیں کہا تھا، وہ بھی ان کا فرمودہ قرار دے کر موردِ لعن وطعن قرار پایا۔

پوری قوم کے علما و اکابر نے، ایک شخص واحد کے خلاف مورچہ قائم کر لیا۔ اور اس پر مسلسل سنگ باری ہونے لگی، اب لوگ انگریزوں سے اتنے خفا، بیزار اور متنفر نہیں تھے۔ جتنے سرسید سے تھے۔

انگریز کے ہاتھ میں تلوار تھی یہ نہتے تھے، لہٰذا اس سے مقابلہ خودکشی کے ذیل میں آتا تھا، لیکن سرسید بھی نہتے تھے، اور یہ بھی نہتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سرسید اکیلے تھے اور ان کی تعداد مور و ملخ کی طرح تھی، ان کا خیال تھا، اور بہ ظاہر غلط نہیں تھا کہ انگریزیت اور انگریز کے اس سب سے بڑے نقیب کو لقمۂ تر کی طرح ہضم کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا، ! سرسید لوہے کا چنا ثابت ہوئے، !

اتنے سخت جان حریف سے آج تک ان حضرات کو پالا نہیں پڑا تھا۔ یہ حریف گالیاں کھاتا تھا، اور مسکراتا تھا، سنگ باری سے لہو لہان ہوتا تھا مگر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس پر کفر کے فتوے لگتے تھے، لیکن یہ تکفیر کرنے والوں کا بھی بدخواہ نہیں تھا۔ جو لوگ اس کی جان کے دشمن تھے۔ یہ ان کی صلاح و فلاح کا طالب تھا۔ جو اسے ختم کر ڈالنا چاہتے تھے یہ انھیں اور ان کی اولاد کو عزت، سربلندی اور وقار کی زندگی کا حامل دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے تھے۔ یہ ان پر پھول نچھاور کرتا تھا۔ !

کیسا عجیب تھا یہ حریف ! ؟

کتنا مشکل تھا اس حریف سے عہدہ برآ ہونا ؟

اور ساتھ ہی ساتھ کتنا ڈھیٹ تھا یہ چیست، چالاک حریف، !

سرسید کا اخلاص اور بے لوثی

اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ جو قوم اسے گالیاں دے رہی تھی۔ اسے کافر

کا خطاب دے رہی تھی، اسے دائرہ اسلام سے خارج کر رہی تھی، اس کے اسلام اور اس کی اسلامیت کو مورد لعن وطعن قرار دے رہی تھی۔ یہ جھولی لے کر اسی کے گھروں پر دستک دیتا، اور دست سوال دراز کر کے کچھ نہ کچھ بھیک لے آتا، بھیک دیتے وقت بھی لوگ اسے ملاحیاں سناتے، لیکن اس کی جبین استقلال پہ شکن تک نہ آتی، ملاحیاں سنتا بھیک کے ٹکڑے جھولی میں ڈالتا، اور واپس چلا آتا۔

اسے بھیک کی اپنے لیے ضرورت نہیں تھی، خدا کا دیا اس کے پاس اتنا تھا، اور اتنا کما لیتا تھا کہ اطمینان سے گوشت روٹی کھا سکتا اور کھاتا تھا۔ یہ بھیک انہی لوگوں کے لیے مانگتا تھا جو بھیک دیتے وقت بھی اسے گالیاں دیتے تھے۔ دریوزہ گری سے جمع کی ہوئی رقم میں کچھ اپنے پاس سے بھی ملا دیتا، اور پھر اسے قوم کی تعمیر نو اور تعلیم جدید کے وسائل مہیا کرنے پر صرف کر دیتا، اسے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیئے تھا، اب تو اس کی زندگی کا، اس کی سرگرمیوں کا، اس کے جوش کار کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔ قوم مسلمان قوم، باوقار، اور سربلند ملت اسلامیہ، !

اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی، !

غدر کے حادثات اور مسلمانوں کی بربادی سے شروع شروع میں یہ اتنا متاثر ہوا تھا کہ ترک وطن کر کے، مصر میں اقامت اختیار کر لینے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا پھر سوچا میری ضرورت مصر کو نہیں، ملت اسلامیہ ہندیہ کو ہے، میں اسی قوم کا ایک فرد ہوں، اسے مبتلائے مصیبت چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا بسوں یہ قوم کے ساتھ غداری ہے، نہیں میں غدار نہیں ہوں میں اپنی ملت سے غداری نہیں کر سکتا، میں اسی دیس میں رہوں گا۔ اور اپنی آشفتہ حال، برگشتہ بخت اور تباہ و برباد قوم کی حالت درست کروں گا۔

یہی سب سوچ کر، اس نے ترک وطن کا ارادہ بدل دیا اور دل وجان سے

اپنی قوم کی خدمت میں مصروف و منہمک ہو گیا۔ اسے خراج تحسین حاصل کرنا نہ انعام و اکرام ملا اس نے انگریزوں کے انعام و اکرام کو ٹھکرا دیا۔ اور ان کے خراج تحسین کو ذرا اہمیت نہ دی۔

یہ تو اپنے خدا کے لیے، صرف اس کی رضا، اور خوشنودی کے لیے یہ کام کر رہا تھا۔ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ، اگر یہ مزد اور اجر کا طالب بھی تھا تو صرف خدا سے!

ہندو مسلم ہم آہنگی کی خواہش

شروع شروع میں سرسید کا خیال تھا کہ اس ملک کو "متحدہ ہندوستان" مسلمانوں نے بنایا تھا، اور اب انگریز بھی اسی پالیسی پر گامزن ہیں۔ کیا حرج ہے اگر چہ یہ صورت قائم رہے، اور ملک کی تمام قومیں یک جہتی، ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ جہد اللبقار میں مصروف رہیں علیحدگی کا تصور ابھی تک اس کے ذہن و دماغ میں نہیں آیا تھا۔

اور آتا بھی تو کیوں؟ اس کی قوم نے اس ملک کے باشندوں کو سلا ہوا کپڑا پہنا سکھایا تھا، یہاں سینکڑوں نئے شہر بسائے تھے، باغات لگائے تھے، نہریں کھودی تھیں، کارواں سرائے تعمیر کیے تھے۔ شاندار اور فلک پیما عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ یہاں کے لوگوں کو ایک نئی زبان دی تھی۔ ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا تھا۔ ایک نیا تمدن عطا کیا تھا۔ ایک نئے معاشرے کا ممبر بنایا تھا۔ دوئی اور تفرقے کا تصور یہ معنی رکھتا تھا کہ ان سب آثار و نقوش سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔ اور علیحدگی کی ضرورت بھی کیا تھی، اگر ایک ہزار سال تک ملک کی دونوں قومیں۔ ہندو مسلمان۔ اتحاد و اتفاق سے رہ سکتی تھیں۔ تو اب کیوں نہ رہیں گی؟ اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں مسلمانوں نے اس رواداری سے حکومت

کی کہ دلی تک میں آبادی کے اعتبار سے وہ اقلیت میں ہی رہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مشترکہ غلامی دونوں قوموں میں، اور زیادہ ارتباط اور ہم آہنگی نہ پیدا کر دے۔

سرسید کی عالی ظرفی و بے تعصبی

یہی کچھ سوچ کر سرسید نہ ہندوؤں سے بدظن تھے، نہ مایوس، ان کے چند بہترین دوستوں میں ہندو بھی شریک تھے، ان کے پوتے، راس مسعود کی رسم عقیقہ جب انجام پائی تو یہ اس پوتے کی موتراشی ایک ہندو کی گود میں ہوئی۔ مدرسۃ العلوم کا خزانچی، سرسید نے ایک ہندو ہی کو مقرر کیا۔ اگرچہ اس کی شکایتیں ہوئیں۔ اس کے خلاف ان کے کان بھرے گئے۔ لیکن یہ اس کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ اسی مدرسۃ العلوم میں، اس نے جس طرح مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں کی تعلیم و تربیت کا بھی پوری مساوات کے ساتھ انتظام کیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے جو سہولتیں بورڈنگ کی حاصل تھیں وہ ساری سہولتیں، مراعات مزید کے ساتھ ہندو بورڈرس کو حاصل تھیں، مدرسۃ العلوم کے اساتذہ میں جس طرح مسلمان تھے، اسی طرح ہندو بھی تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا۔ نہ سوچنے پر تیار تھا کہ یہ قومیں ندی کے دو کنارے ہیں۔ جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتے۔ یہ اپنی دھن میں لگا رہا۔ اپنا کام کرتا رہا۔ اپنی قوم سے مانگا اور لایا ہوا چندہ، مسلمان طلبہ کی طرح، ہندو طلبہ پر بھی خرچ کرتا رہا۔ تنگ دلی، مسلمان کی شان نہیں، اور یہ سید عالی وقار، اور ذات والا تبار، کوئی شبہ نہیں، صحیح معنی میں مرد مسلمان اور بندۂ مومن تھا۔

انتہائی غیر متعصب، روادار، عالی ظرف، اور بلند حوصلہ ہونے کے باوجود اگر کسی حد تک، وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں، امتیاز روا رکھتا تھا، تو اس لیے کہ ہندوؤں کو سرکار دولت مدار کی سرپرستی حاصل تھی۔ سارے ملک کی تعلیم گاہوں

کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے تھے، سرکاری ملازمتوں میں وہ کثرت سے شریک ہو چکے تھے، اور یہ سلسلہ برابر جاری تھا، سرسید چاہتے تھے مسلمان تلخ جذباتی دور میں جو نقصان اٹھا چکے ہیں اس کی جلد از جلد تلافی کر لیں۔ اور ملک کے انتظام و انصرام میں ہندوؤں کے دوش بدوش حصہ لینے لگیں، انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت کے شوق میں ... ہندوؤں نے دین و مذہب کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جب ضرورت محسوس کی عیسائی بن گئے۔ سرسید اس کے لیے تیار نہیں تھے وہ مسلمانوں کو مسلمان رکھ کر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھانا چاہتے تھے، تاج برطانیہ سے وفاداری کے یہ معنی انھوں نے کبھی نہیں لیے کہ مسلمان اسلام سے بے پرواہ ہو کر ترقی کریں۔ اس طرح کی ترقی کسی اور قوم کو راس آتی، مسلمان قوم کو ہرگز راس نہ آتی۔

سرسید دل سے چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ مل کر رہیں۔ ایک ساتھ ترقی کریں۔ اور گزشتہ ہزار سال کی یکجائی اور یک جہتی نے جو اشتراکِ زندگی کے مختلف شعبوں میں قائم کر دیا ہے۔ وہ قائم رہے، اس میں اضافہ ہو، اور وہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا جائے۔ لیکن حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ یہ خواب واقعہ اور حقیقت نہ بن سکا، خواب پریشاں بن گیا۔ یہ دوسرا عظیم صدمہ تھا، جو غدر کے بعد سرسید کو پہنچا تھا۔ لیکن یہ صدمہ پہلے صدمے کی طرح صرف ایک جانکاہ المیہ نہ تھا۔ یہ مبارک اور مسعود تھا۔ اسی صدمے کی بدولت سرسید کے دل میں وہ انجانا سا۔ مبہم سا، قید الفاظ کی گرفت سے چھوٹ جانے والا تخیل پیدا ہوا۔ جس کا سرسید کو کوئی نام نہ رکھ سکے، نام بہت بعد میں تجویز ہوا۔ پاکستان۔!

ہندوؤں کی اردو دشمنی اردو زبان، ہندی بھاشا کی ترقی یافتہ

صورت تھی۔ البتہ اس میں فارسی کے اسماء و اعلام زیادہ تھے اور اس میں شعر و شاعری اور شاہانہ سرپرستی کے باعث ایسی رعنائی پیدا ہوگئی تھی کہ دونوں قومیں اسے اپنی زبان تسلیم کرنے لگی تھیں۔ اس زبان کی تشکیل و تعمیر میں ہندوؤں کا بھی قابل فخر حصہ تھا۔ لیکن انگریزوں نے اپنے اسکولوں اور کالجوں میں جو نصاب تعلیم رکھا وہ مسلم دشمنی پر مبنی تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ یک جہتی ختم کرانے لگی جو اب تک پائی جاتی تھی بلکہ اختلاف و افتراق شروع ہوگیا۔ ہندوستان کی سرکاری زبان غدر سے پہلے تک فارسی تھی، لیکن عوامی اور روزمرہ کی زبان اردو تھی، ہندوؤں نے سب سے پہلا مورچہ اسی کے خلاف قائم کیا۔

۱۸۶۷ء میں، اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو ختم کرنے کی باقاعدہ جدوجہد ہندوؤں کی طرف سے شروع ہوگئی، اس کا آغاز بنارس سے ہوا۔ اب ہندوؤں کا مطالبہ یہ تھا کہ بھاشا زبان ملک کی زبان بنائی جائے۔

ہندوؤں سے سرسیّد کی مایوسی

اس حادثے کا سرسید نے جو اثر قبول کیا وہ انہی کے الفاظ میں بقول مولانا حالی یہ ہے:۔

"یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے کی کوشش کرنا محال ہے۔ انہی دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا تو ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو بنارس کے کمشنر تھے۔ میری ملاقات ہوئی، میں مسلمانوں کی جداگانہ تعلیم کے باب میں (ان سے) گفتگو کر رہا تھا۔ اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو کو سن رہے تھے، آخر انھوں نے کہا:۔

"آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال

ظاہر کیا کرتے تھے۔!"

میں نے کہا:۔

" اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں دل سے کسی کام میں شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے چل کر اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

مسٹر شیکسپیئر نے کہا :۔

" اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس (کی بات) ہے ! "

میں نے کہا :۔

" مجھے بھی نہایت افسوس ہے، مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

سرسید کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے، ظاہر ہے ایک ملک میں رہنے والی اور بسنے والی دو قومیں، اگر مشترک ورثے سے دست بردار ہو جائیں اور تفرقہ پسندی کو اپنا شعار بنالیں تو کس بنیاد پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ متحد اور منظم ہو سکیں گی۔

سرسید کے ان ارشادات سے ثابت ہوتا ہے کہ :۔

وہ ہندوؤں سے جب تک دل برداشتہ نہیں ہو گئے، مسلمانوں کی ملی انفرادیت کے تخیل سے بالا رہے۔

ہندو مسلم ہم آہنگی کے وہ اب تک اس درجہ قائل رہے تھے کہ مسٹر شیکسپیئر جو عرصۂ دراز سے سرسید کو جانتے تھے۔ اور ان کے کردار و سیرت سے بخوبی واقف تھے اور جن کی زندگی بلوائیوں سے سرسید ہی کی بدولت محفوظ رہی، ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیرت ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے۔

بہر حال اب سرسید چوکنا ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود اب تک "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عامل تھے کہ شاید ہندو اپنی ناعاقبت اندیشی کو محسوس کر لیں

ساتھ ہی ساتھ وہ جائز امور میں ہندوؤں سے اشتراک بھی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۸۸۴ء میں بابو سریندر ناتھ بنرجی نے نیشنل فنڈ اور نیشنل لیگ قائم کرنے کے سلسلے میں ملک کا دورہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ حکومت انگلستان سے اگر کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنی ہو تو وہ منظم طور پر پیش کی جائے۔ اور مصارف اس فنڈ سے ادا کیے جائیں۔ بنرجی نے علی گڑھ کا دورہ بھی کیا۔ جلسے کے صدر سرسید تھے۔ اور انھوں نے ان مقاصد کی پوری تائید کی۔

"دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی کے زمانے بھی سرسید نے آنے والے خطرات کا بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ اور بالکل درست طور پر وہ انھیں محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ نیشنل لیگ نے یہ محسوس کر کے کہ ہند و اب اتنے مضبوط ہو گئے ہیں کہ انگریزوں سے اختیارات حکومت کا (رفتہ رفتہ) مطالبہ کر سکتے ہیں، شر انگیز سرگرمیاں شروع کر دیں جن سے متاثر ہو کر اور مسلمانوں کا اس طرف رجحان دیکھ کر مدراس کے گورنر نے اپنی ایک تقریر میں صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی ذرا پرواہ نہیں کرتا لیکن اگر باز اس کے سامنے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ ڈالتا ہے!"

اس تقریر سے سرسید نے بجا طور پر خیال کیا کہ ہندوؤں کی یہ شورش پسندی جنگِ آزادی سمجھی جا سکتی ہے۔ لیکن مسلمان باغی قرار دیدیے جائیں گے اور اُن کی گردن "توڑ" دی جائے گی۔

سرسیّد کی سیاسی جدوجہد

پھر بھی انھوں نے ہندوؤں کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ البتہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں اور زیادہ سرگرم ہو گئے۔ ۱۸۸۸ء میں جب وائسرائے کی کونسل میں سلف گورنمنٹ کا مسودہ زیر بحث آیا۔ جس کی بنیاد اصول انتخاب و نیابت پر تھی تو سرسیّد نے

محسوس کرلیا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی قبول کرنے کی کوششیں شروع کردی گئی ہیں۔ ہندوؤں کی طرف سے انتخاب و نیابت کی تائید زور و شور سے ہو رہی تھی۔ سرسید نے اس دامِ ہمرنگِ زمین کو محسوس کرلیا۔ وہ اصولاً انتخاب اور حقِ نیابت کے مخالف نہیں تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر کونسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"میں کنزرویٹو نہیں لبرل ہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا۔ جب ہندوستان سلف ہلپ، اور سلف گورنمنٹ کا اصول سیکھنے کو ہے۔ جس نے انگلستان میں "نمائندہ ادارے" پیدا کیے ہیں۔!"

"انگلستان سے ریپریزینٹیو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے، جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے مابین امتیاز پایا جاتا ہے۔"

آگے چل کر سرسید نے وہ بات کہی جسے لے کر قائداعظم آگے بڑھے اور پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا۔ سرسید نے کہا:-

"ہندوستان فی نفسہ ایک برّاعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے ذات پات کا قاعدہ بہت شدّومد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں، ایک گروہ دولت منداور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا ذی علم اور ذی رعب اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو، اور روشن ضمیری کے جس درجے تک وہ پہنچ گیا ہو

وہ درجہ باقی باشندوں کے درجے سے بہت اعلیٰ ہو۔ ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اس کی طرف سے ممبران کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپریزینٹیو انسٹی ٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکلیں اور سوشل خطرات پیدا ہوں گے۔"

یہ باتیں بھی وہی ہیں جن کی طرف قائداعظم اپنی تقریروں میں اشارہ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن آگے چل کر سرسید نے جو کچھ کہا وہ تو تحریک پاکستان کی اساس تھی:

"ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا۔ اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلاف تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں۔ وہاں ایسی مشکلیں پیش نہیں آتیں، قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں یہودیوں کو جگہ دینے میں کوئی عذر نہیں ہوتا لیکن ایسے ملک میں جیسا ہندوستان ہے، جہاں ذات پات کے اختلافات اب تک موجود ہیں۔ جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں۔ جہاں مذہبی اختلافات زور و شور پر ہیں۔ اور جہاں تعلیم نے تمام فرقوں میں مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی مجھے یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں (ڈسٹرکٹ بورڈوں) کے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول جاری کرنے سے بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات پات کا

امتیاز ہندوستان میں ایک جزو اعظم رہے گا۔ اس وقت تک بڑی قوم چھوٹی قوم پر بالکل غالب آجائے گی۔"

سرسیّد کی فراست ایمانی

واضح رہے۔ یہ "سلف گورنمنٹ" اسمبلی اور مجلسِ قانون ساز کی صورت میں نمودار نہیں ہو رہی تھی یہ "لوکل سلف گورنمنٹ" تھی، یعنی اس کی کارگزاری، صرف میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ تک محدود تھی۔ پھر بھی پوری فراست ایمانی کے ساتھ سرسیّد نے آنے والے دور کی واضح تصویر دیکھ لی تھی اور محسوس کر لیا تھا کہ انتخاب اور نیابت کی عمومیت مسلمانوں کو اور زیادہ پسماندہ اور ہندوؤں کو اور زیادہ طاقتور بنا دے گی جمہوریت کے نام پر ہندو اکثریت، مسلم اقلیت پر من مانے مظالم توڑے گی اور ان کے حقوق پامال کرے گی۔

پھر بھی یہ سرسید کی عالی حوصلگی کی انتہا تھی کہ اب تک انھوں نے کانگریس کے خلاف لب کشائی نہیں کی تھی۔

سرسیّد کی پالیسی

سرسید، نہایت خاموشی، لیکن خلوص اور سرگرمی کے ساتھ جس پالیسی پر عامل تھے وہ یہ تھی :-

۱۔ فی الحال عملی سیاسیات سے من حیث القوم مسلمانوں کی کنارہ کشی۔

۲۔ پوری قوت اور انہماک کے ساتھ تعلیمی کوتاہیوں کا ازالہ۔

۳۔ مسلم حقوق اور مفاد کے تحفظ اور بقاء کے لیے سینہ سپر ہو جانا خواہ حریف مقابل انگریز ہو یا ہندو۔

۴۔ ہندوؤں کی اور ان کی قائم کردہ سیاسی اور سیاست آمیز مذہبی انجمنوں اور تحریکوں کی مخالفت سے حتی الامکان اجتناب۔

۵۔ مسلمانوں کو غیر اسلامی افکار سے اور مذہب سے قطع نظر کر کے خالص وطن پرستانہ سرگرمیوں سے باز رکھنے کی سعی و کوشش۔

اور ان امور پنجگانہ میں سب سے زیادہ زور سرسید جس چیز پر دے رہے تھے، وہ تعلیمی کوتاہیوں کا ازالہ تھا۔

مسلمانوں کی بے حسی

صورت احوال یہ تھی کہ اتنی بڑی چوٹ کھانے کے بعد بھی مسلمان اب تک نہیں چونکے تھے، وہ

انگریز دشمنی اور انگریزی تعلیم سے کامل اجتناب کو اب تک ضروریات دین میں سے سمجھ رہے تھے، اس کے برعکس ہندو، نہ صرف اپنی تعلیمی کوتاہیوں کا ازالہ کر چکے تھے بلکہ بہت آگے بڑھ چکے تھے اور بڑھتے چلے جا رہے تھے، سرسید ان کی ان سرگرمیوں سے خوش تھے، برہم نہیں تھے، وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی ان سے پیچھے نہ رہیں۔

سرسیّد کی رواداری

مسلمانوں کی ہمدردی کے ساتھ ساتھ اگرچہ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کے اطراف واکناف میں ہندو کالج قائم کر رہے ہیں، اور ان میں مسلمانوں کو داخلہ نہیں ملتا لیکن انھوں نے علی گڑھ کے دروازے ہندو طلبہ کے لیے پوری بے تعصبی اور رواداری کے ساتھ غیر مشروط طور پر کھول رکھے تھے۔ مولانا حالی نے چند سال کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس مدت میں

"جس قدر ہندو طالب علم محمڈن کالج اور اس کی لا کلاس سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہو کر نکلے ہیں ان کی تعداد یہ ہے:۔

گریجویٹ	۲۲
انڈر گریجویٹ	۶۷
انٹرینس	۷۸
ایل ایل بی	۵
وکالت ہائی کورٹ	۲
وکالت ضلع	۵
	۱۹۲

یہ تھا سرسید کی رواداری اور فراخ حوصلگی کا حال، انگریزی تعلیم کے باب میں یا دوسرے الفاظ میں فرنگی راج سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں ہندوؤں اور

مسلمانوں کا نہایت نمایاں فرق تھا جو غدر سے بھی پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کی اہمیت کا احساس

۱۸۲۴ء میں انگریزوں نے جب ہندوؤں کا دل موہنے کے لیے کلکتے میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو فوراً سرکار عالیہ کی خدمت میں ایک عرض داشت ان کی طرف سے پیش آئی۔

"ہم یہ ضرورت نہیں محسوس کرتے کہ حکومت ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سروسامان بہم پہنچائے، ہم جس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت ہمارے لیے انگریزی تعلیم کا بندوبست کرے،!"

اور اس عرض داشت کے گیارہ سال بعد، جب ہندو انگریزی تعلیم میں بہت آگے نکل چلے تھے، اور انگریز بھی فضا کو خوش گوار اور موافق دیکھ کر وسیع اور ہمہ گیر پیمانے پر انگریزی تعلیم کے فروغ و ترویج کا منصوبہ تیار کر رہے تھے، مسلمانوں نے بھی ایک عرض داشت تیار کی، جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے، اور جس میں "عرض" کیا گیا تھا کہ:-

"فرنگی حکومت کا انگریزی تعلیم کے فروغ و ترویج پر اس قدر زیادہ توجہ کرنا اس امر کی واضح اور زبردست دلیل ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے!"

دونوں قوموں کے نقطۂ نظر کا فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے، نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے، اسے ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ آگے چل کر جو مباحث آئیں گے وہ اس روشنی میں زیادہ واضح ہو سکیں گے۔

ہندوؤں کا سیاسی لائحہ عمل

انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہونے اور انگریزوں کا حد سے زیادہ اعتماد حاصل کر لینے کے بعد بلکہ اسی دوران میں ہندوؤں نے سیاست کی طرف بھی توجہ کی۔

شروع ہی سے چند باتیں ان کے پیش نظر تھیں

۱۔ انگریزوں کے نظام حکومت اور طرز جہاں بانی سے وہ بخوبی واقف ہو چکے تھے انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ فرنگی نظم مملکت "جمہوریت" یعنی اکثریت کی حکومت پر قائم ہے

۲۔ ہندوستان کا آئندہ نظام، خواہ اس میں کتنی ہی مدت لگ جائے، اس اصول پر مبنی ہوگا، جس میں طویل غلامی کے بعد پہلی مرتبہ ہندوؤں کو مکمل اختیاراتِ حکومت حاصل ہوں گے۔

۳۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا، ہندوستان کی اقلیتوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص "قومیت متحدہ" کے فریب میں مبتلا رکھنا چاہیئے، اس فریب میں وہ بآسانی اس لیے مبتلا ہو جائیں گے کہ متحدہ ہندوستان، متحدہ قومیت، متحدہ تہذیب، متحدہ تمدن، متحدہ زبان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متحدہ معاشرہ انہی کی پیداوار ہے۔

۴۔ ساتھ ہی ساتھ، مسلمانوں کو، مختلف شہروں میں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت دبانے کے لیے "ہندو مسلم" فسادات بھی جاری رکھے جائیں، جن میں زیادہ نقصان بہرحال مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑے گا، وہ لاکھ بہادر ہوں، لیکن مقابلہ جب ایک اور چار کا ہوگا، تو کسی نہ کسی درجے میں، پلڑا انہی کا ہلکا ہوگا۔

۵۔ وقتاً فوقتاً انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی منظم اسکیم بھی جاری رہنی چاہیئے تاکہ رہی سہی کسر انگریزوں کا استبداد پوری کر دے، اور جو نقصان ہندوؤں سے نہ پہنچ سکے، وہ انگریزوں سے پہنچ جائے۔

ہندوؤں کی چند نیم سیاسی مذہبی انجمنیں

ہندوستان کی سیاسی اور سیاست آمیز مذہبی تحریکوں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ہمارا یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔

ہندوستان میں سب سے پہلی سیاسی انجمن غدر سے چند سال پہلے، ہندوؤں نے اصول و آئین کو مدنظر رکھتے ہوئے، یاد رکھیے ہندوؤں کے ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی غیر آئینی، اور قانون شکنی کا تصور بھی موجود تھا۔ یہ جرأت تو بہت عرصے بعد مسلمانوں کے طفیل ان میں پیدا ہوئی۔ عالم وجود میں آئی۔ ۱۸۵۱ء میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ اس کی وفادارانہ ذہنیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔

لیکن یہ ایسا زمانہ نہیں تھا کہ ہندو کچھ حاصل کر سکتے۔ اس لیے کہ گو حکومت کا سارا اقتدار و اختیار ان کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ان کی حیثیت نائب شاہ سے زیادہ نہ تھی اور فی الوقت وہ ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا یہ انجمن شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی اور بہت جلد ختم ہو گئی۔

اب ہندوؤں نے مزید فہانت کا ثبوت دیا یعنی انھوں نے سوچا، انگریزوں نے جو نصاب تعلیم رائج کیا ہے۔ وہ مسلم دشمنی کے جذبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس میں مسلمان فرمانروایانِ ہند کی ایسی جھوٹی کہانیاں تاریخ بنا کر پیش کی گئی ہیں، جن کا لازمی نتیجہ ہندو مسلم منافرت کی صورت میں، یا کم از کم ہندو مسلم افتراق کی صورت میں نمودار ہوگا۔ اس زمانے میں اگر کچھ ایسی تحریکیں چلائی جائیں جو بظاہر مذہبی ہوں، لیکن حقیقتہً ان کا مقصد ہندو قوم کے سیاسی شعور کو پختہ کرنا اور بھڑکانا ہو تو خود بخود سیاست مذہب سے آگے نکل جائے گی۔ اور ہندو سیاسی طور پر زیادہ مضبوط

اور طاقت ور ہو جائیں گے۔

چنانچہ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی وفات کے چند سال بعد یعنی غدر کے زمانے کے لگ بھگ ہندوؤں نے قوم اور مذہب کے نام پر ملک کے متعدد مقامات پر نئی انجمنیں قائم کیں، جن کا مقصد ظاہری طور پر اصلاح عقائد، تعمیر فکر، اور تخلیق جذبۂ قومیت کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن جاننے والے محسوس کر رہے تھے

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

بہر حال اس مقصد کے ماتحت ہندوستان کے مختلف مقامات پر جو انجمنیں قائم ہوئیں، وہ حسب ذیل تھیں۔

بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے "برہمو سماج" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو فکر و اعتقاد کے لحاظ سے اسلام سے قریب تر اور سیرت اور کردار کے اعتبار سے مسلمانوں کی دشمن تھی۔

پنجاب میں "آریہ سماج" کے نام سے سوامی دیانند نے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس نے بھی اسلام کے عقائد فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لیے لیکن مسلم دشمنی میں اس کی تیز رفتاری کی کوئی انتہا نہ تھی۔ برہمو سماج والے مہذب اور شائستہ تھے۔ آریہ سماج والے دریدہ دہن اور گستاخ، وہ خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے عادی تھے۔ اور یہ سب وشتم کے ڈھول اور تاشے بجاتے ہوئے میدان میں آئے تھے، آریہ سماج کی "کتاب مقدس" ستیارتھ پرکاش جہاں متعدد اعتبارات سے حد درجہ دلچسپ خندہ آور اور مجموعۂ عجائب و غرائب ہے، وہاں حد درجہ اشتعال انگیز بھی ہے، ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے میں اس سماج نے اور اس کتاب نے جو حصہ لیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ گاندھی جی نے بھی جب پہلی مرتبہ ستیارتھ پرکاش کا مطالعہ کیا تو تلملا اٹھے۔ اور اپنے اخبار "ینگ انڈیا" (YOUNG INDIA) میں اس کے خلاف

ایک نہایت سخت اداریہ لکھا، جسے ان کے سناتن دھرمی تعصب پر محمول کیا گیا۔

مدراس میں تھیاسوفیکل سوسائٹی عالم وجود میں آئی، یہ بھی برہمو سماج کی طرح مہذب اور شائستہ تھی۔ اور اسی کے نقش قدم پر سعادت مندی کے ساتھ چل رہی تھی فرق یہ تھا کہ دیانند "سوامی" تھے۔ اور یہ گروصاحب، سیاسی لیڈر، لہٰذا انھوں نے صرف دشنام طرازی اور سب وشتم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کے سروسینے پر ضربیں بھی بے دردی کے ساتھ لگائیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب مسلمان بالکل "ازاں سوراندہ ازیں سودرماندہ" ہو رہے تھے۔ اور ہندو ضرورت سے زیادہ قوت وطاقت حاصل کر چکے تھے۔ تو باقاعدہ سیاسی انجمنوں کی تشکیل کا سلسلہ ہندوؤں کی طرف سے شروع ہو گیا۔

چنانچہ ۱۸۷۶ء میں یا اس کے لگ بھگ جو سیاسی انجمنیں قائم ہوئیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ مدراس میں:- "مہاجن سبھا"

۲۔ پونہ میں:- "سروجانک سبھا"

۳۔ بنگال میں:- "انڈین ایسوسی ایشن"

۴۔ بمبئی میں:- "بمبئی ایسوسی ایشن"

۵۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۸۵ء کو "آل انڈیا یونین" معرض وجود میں آئی۔ ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۶ء میں اسی انجمن نے آل انڈیا کانگریس کا قالب اختیار کر لیا۔ جس کے روح رواں ایک انگریز مسٹر ہیوم تھے۔

پونہ کی سروجانک سبھا مسٹر تلک کی ساختہ پرداختہ تھی، انھوں نے انگریزوں کو تو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ:-

"ہم بھگوان کی مورتی (انگریزی حکومت) ہٹانا نہیں چاہتے ہم تو اس کے پجاریوں (سرکاری ملازموں) میں اپنا حصہ چاہتے ہیں!"

اور مسلمانوں کے خلاف لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آگئے۔

۶ - چنانچہ ۱۸۹۳ء میں مسٹر تلک نے ایک خاص فرقہ وارانہ اور مسلم دشمن جماعت ANTI COW KILLING ASSOCIATION یعنی "انجمن مخالف ذبیحہ گاؤ" کے نام سے قائم کی، مقصد عالی نام نامی سے ظاہر ہے۔ مسٹر تلک انگریزوں سے خوشامد درآمد کر کے جتنے بھی اختیارات حکومت مل سکیں، حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ تحریک انگریزوں کے خلاف نہیں تھی جو دن دہاڑے، اور علی الاعلان اپنی فوج وسپاہ کو بے شمار گائیں کاٹ کر کھلا دیتے تھے اور خود بھی نوش جان فرماتے تھے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف تھی جو عید قرباں پر اور ہندوؤں کی بیچی ہوئی ان گائیوں پر جو ناکارہ اور نکمی ہو چکی تھیں، قصائی کی چھری چلا لیا کرتے تھے۔

مسٹر تلک کی جولانی طبع کے لیے جب "انجمن مخالف ذبیحہ گاؤ" ناکافی ہوئی تو انھوں نے اپنی قوم کو تحفے کے طور پر ایک نیا تہوار دیا۔ یعنی "گنپتی" کا تہوار رائج کیا۔ رواج کے مطابق مساجد کے سامنے باجا بجانے پر حکومت کی طرف سے جو پابندیاں رائج چلی آرہی تھیں، یہ تہوار ان کے خلاف موثر اور عملی احتجاج تھا۔ اور اس طرح بڑی آسانی سے فتنہ وفساد اور کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ اس کارنامے کا لازمی نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی قوم کے محبوب لیڈر بن گئے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ ایک صحافی بھی تھے۔ اور ان کی صحافت دو دھاری تلوار کا کرشمہ دکھا رہی تھی۔ ان کا ایک انگریزی اخبار تھا "مرہٹہ" جو آزادیٔ تحریر کے قانون سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اور دوسرا مرہٹی زبان میں نکلتا تھا، جس کا نام "کیسری" تھا، یہ بھی اپنی قیامت خیزیوں میں پہلے سے کم نہ تھا۔

نگہ ہو یا مژہ ہو، ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
لئے تیرِ قضا، اس کو پر تیر قضا سمجھے

یہ "تیرِ قضا" اور "پرتیرِ قضا" بڑی تیزی سے اپنا کام کر رہے تھے۔

۷۔ اس سال ۱۸۹۳ء میں جسٹس محمود سید، سرسید کے فرزند دلبند نے علی گڑھ میں "ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم کی، اس انجمن کے اغراض و مقاصد ظاہر ہے دفاعی تھے۔ جارحانہ نہیں تھے۔ ایک طرف یہ ستم رانیاں دوسری طرف بلدیات وغیرہ میں مخلوط انتخاب پر اصرار۔ کیونکہ اس وقت مجالسِ آئین ساز وجود میں نہیں آئی تھی۔

سید محمود نے اس انجمن کی طرف سے ایک نہایت مدلل اور مبرہن یادداشت مرتب کی جو مخلوط انتخاب کے خلاف تھی۔ اور یہ گو مسلمانوں میں ملی انفرادیت کے تحفظ اور بقا کی پہلی کوشش تھی۔

۸۔ ۱۸۹۵ء میں مسٹر تلک نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس مرتبہ وہ ہندو لیڈر سے زیادہ مرہٹہ لیڈر کے بہروپ میں نمودار ہوئے۔ اب وہ ایک نئی تحریک کے بانی تھے جس کا مقصد مرہٹہ ہیروؤں کے کارناموں کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا تھا۔

مسٹر تلک یہ کام کس ذہنیت کے ماتحت کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے بمقام رائے گڑھ شیواجی اور افضل خان کا تذکرہ کرتے ہوئے کی تھی۔ انھوں نے بغیر کسی جھجک کے فرمایا:-

"افضل خان کے حادثۂ قتل پر تحقیق و تدقیق بیکار ہے ہم تسلیم کرتے ہیں شیواجی نے قتل کا منصوبہ پہلے سے بنا رکھا تھا۔ اور دھوکے سے افضل خاں کو قتل کر دیا۔ لیکن کیا افضل خاں کو قتل کر کے شیواجی نے کوئی گناہ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب مہابھارت کے واقعات سے مل سکتا ہے۔ کرشن جی نے گیتا میں تلقین کی ہے۔ کہ اگر ضرورت ہو تو اپنے استادوں اور عزیزوں کے قتل میں بھی تامل نہ کرنا چاہیئے۔ ہم پر ہرگز ان کے قتل کے سلسلے میں کوئی الزام عائد نہ ہوگا اگر ہم ذاتی اغراض کے لیے یہ نہ

کریں۔ شیواجی نے غیر ملکیوں (مسلمانوں) کو اپنی مادر وطن سے نکالنا چاہا یہ کوئی جرم نہیں ہے، اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی کیا وہ کوئی گناہ نہیں تھا!"

شیواجی کی ہر دل عزیزی ہندوؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی، چنانچہ ۱۸۹۷ء میں انھیں "لوکمانیہ" کا خطاب قوم کی طرف سے دیا گیا، جس کے معنی ہیں "محبوب قوم"!

اور ہندو قوم کا یہ "محبوب قائد" برابر اپنی محبوبیت میں اضافہ کرتا رہا!

مسلمان اور کانگریس

بلاشبہ یہ حالات دیکھتے ہوئے بھی کچھ مسلمان ایسے تھے جو کانگریس کے فریب میں مبتلا تھے۔ نہ صرف وہ خود ذاتی طور پر کانگریس میں حصہ لے رہے تھے بلکہ اپنی قوم کو بھی ترغیب دے رہے تھے کہ وہ کانگریس میں شریک ہو کر ہندو اکثریت کے ہاتھ مضبوط کرے، ان لوگوں میں پیش پیش بدرالدین طیب جی تھے، طیب جی کے علم و فضل، قابلیت اور اہلیت، خلوص اور حب اسلام، ہر چیز شک و شبہے سے بالا تھی، لیکن ان کی فہم سیاسی نکتہ چینی اور تنقید سے ماورا نہیں تھی اور سرسید اس ذہنیت کے علمبردار مسلمانوں کے نہایت جری نکتہ چیں اور نقاد تھے۔ انھوں نے مسٹر بدرالدین طیب جی کو اس سلسلے میں جو مکتوب لکھا تھا اس کا یہ حصہ خاص طور پر غور طلب ہے:-

"امریکہ میں اول اول اسی قسم کا ایجی ٹیشن (جو کانگریس نے شروع کر رکھا ہے) پیدا ہوا تھا، اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منہ سے نکلا یہ تھا:- "NO TAXATION WITHOUT REPRESENTATION"

پس جن لوگوں میں (بہ حالت موجودہ) یہ لفظ کہنے کی طاقت ہو وہ کانگریس کے اس ایجی ٹیشن میں شریک ہوں ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجانی ہیں — غدر میں

کیا ہوا؟ ہندوؤں نے (پس پردہ رہ کر) شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے بیچ میں کود پڑے، ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے"!

سرسید نے اپنے خط میں جس اہم ترین نکتے کی طرف طیب جی کی توجہ مبذول کرائی تھی، وہ اگر پوری طرح ان کے ذہن نشین نہ ہو سکا، تو ایک حد تک وہ قابل معافی بھی تھے، طیب جی مغربی ہند (بمبئی) کے رہنے والے تھے، جہاں تک غدر کے شعلے نہیں پہنچے تھے، مغربی ہند نے ان تباہیوں کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا تھا، جو شمالی ہند (دہلی اور یوپی) وغیرہ میں مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑیں، لہٰذا طیب جی اگر بے پروا اور تازہ دم تھے تو اس کی بنیاد ناواقفیت پر تھی، اور سرسید اگر محتاط اور دہشت زدہ تھے تو ان کی بنیاد ان لرزہ خیز واقعات پر تھی جو بہ چشم خود انھوں نے دیکھے تھے اور غیر معمولی رسوخ رکھنے کے باوجود مسلمانوں کو تباہی، قتل، بربادی اور ذلت سے نہ بچا سکے۔

کانگریس کے خلاف سرسید کا جہاد

ان حالات میں سرسید کے لیے ناممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت گوارہ کریں، اور مخلوط انتخاب قبول کر سکیں، لہٰذا انھیں کھل کر میدان میں آنا پڑا، اور مسلمانوں کو مشورہ دینا پڑا کہ وہ کانگریس میں شرکت کر کے اپنی بربادی اور ہلاکت کے پروانے پر دستخط نہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرسید، نہ آزادیٔ ہند کے مخالف تھے، نہ دورِ غلامی میں نیابتی طرزِ حکومت سے انھیں اختلاف تھا، البتہ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ مسلمان آقاؤں کی تبدیلی پر رضامند ہو جائیں یعنی انگریز کے بجائے ہندو کی غلامی قبول کر لیں اور نیابتی طرزِ حکومت، بغیر کسی شرط اور پابندی کے قبول کر کے اپنی قومی انفرادیت سے محروم ہو جائیں اور تمام تر ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے لگیں

وہ یہ بھی جانتے تھے، اس اکثریت کے لغت میں "رحم و کرم" کا نام ہی نہیں ہے جو اکثریت اپنے کروڑوں ہم قوم اور ہم مذہب افراد کو اچھوت بنائے ہوئے ہے، اور ان سے جانوروں سے بدتر سلوک کر رہی ہے وہ مسلمانوں کے باب میں حوصلہ مند، روادار، اور فرشتہ سیرت کیسے ہو سکتی ہے؟

سرسید کے اس طرزِ عمل کی مدافعت کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے اور بالکل سچ لکھا ہے:-

"وہ (سرسید) ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے لیکن (بہ حالت موجودہ) وہ ہندوستان کو فی الحال اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں ریپریزنٹیٹو اصول کے ماتحت عمل کیا جائے!"

آگے چل کر مزید فرمایا ہے:-

"انگلستان میں جو سب سے بڑا اعتراض ہوم رول بل پر مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر کو اسے پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئرلینڈ میں رومن کیتھولک کی تعداد بہ مقابلہ پروٹسٹنٹ فرقے کے بہت زیادہ ہے پس اگر یہ بل پاس ہو جائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں، ایک فرقے کی مجاریٹی دوسرے فرقے کے حق میں اس قدر مضر خیال کی جاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں پر خلاف تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ ریپریزنٹیٹو اصول سے کب بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟"

کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ جس سنگ گراں کے باعث آئرلینڈ "ہوم رول" نہ حاصل کر سکا، اسے ہندوستان میں نظر انداز کر کے مخلوط انتخاب، اور آزادی زیر سایہ

برطانیہ کی کوششوں میں مسلمانوں کو شریک کرنے کی کوشش کی جارہی تھی،

بہرحال سرسید میدان میں آگئے تھے، اور انھوں نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش شروع کردی تھی،

۸ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں، اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔

سرسید نے ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں پہلی بار واضح اور صاف طور پر کانگریس کے خلاف لب کشائی کی:-

"اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں توکسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہندوؤں کی تعداد بہ مقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے، پس اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا توچار ہندو ممبر ہوں گے!"

اور اس طرح مسلمان محکوم اور بے سہارا ہوکر رہ جائیں گے!،

کانگریس کی ایک خاص تکنیک

مارچ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ میں سرسید نے ایک اور طویل تقریر کی انھوں نے جس بات کو اصرار، شدت اور زور کے ساتھ پیش کیا وہ کانگریس کی وہ "تکنیک" تھی جسے وہ اپنے یوم پیدائش سے استعمال کرتی چلی آئی ہے۔ یعنی یہ جھوٹا دعویٰ کہ مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔ قائداعظم کو اور ان سے پہلے مولانا محمد علی کو بھی اسی تکنیک سے واسطہ پڑا، سرسید نے اس خام خیالی کی تردید فرمائی، یعنی

"کانگریس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگریس میں شریک ہوئے ہیں انھوں نے غلطی کی ہے۔ اوران کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیثیت القوم کانگریس میں شریک ہیں"

سرسید نے یہ خیالات کانگریس، اس کی تیکنک اور حکمت عملی کے بارے

میں آج سے ساٹھ سال پہلے ظاہر کیے تھے۔ لیکن کانگریس نے اس تکنیک کو اس خوبی اور کمال کے ساتھ اپنے دامن سے وابستہ رکھا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس دنگر سے نہیں ہٹی۔

جو بات کانگریس ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۸ء میں زور شور اور شدت کے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ وہی بات ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے وقت، ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی شروع کرتے وقت، ۱۹۳۱ء کی پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں، ۱۹۳۴ء کی مصالحتی کانفرنسوں میں، ۱۹۳۷ء میں صوبائی مجالس آئین ساز کے پہلے آزادانہ انتخاب کے وقت، ۱۹۳۹ء میں مطالبۂ پاکستان کا رد کرتے وقت اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک برابر بغیر کسی انقطاع کے تواتر اور تسلسل کے ساتھ کہتی رہی۔ کبھی گاندھی جی کی زبان سے، کبھی جواہر لال کے منہ سے۔ کبھی پٹیل کے نطق قیامت خیز سے، اور جس کا آخر کار نتیجہ یہ نکلا۔ کہ پاکستان بن گیا۔

اگر سر سید نے ساٹھ برس پہلے، برطانوی طرز کے جمہوری اور نیابتی نظام کی ایک چٹان کی طرح مخالفت نہ کی ہوتی اور کانگریس اپنی تکنیک میں کامیاب ہو جاتی تو بلاشبہ کبھی اور کسی طرح پاکستان عالم وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس

کے

قیام کا پس منظر اور دستاویزی تاریخ

کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ سرسید نے، دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس کی سرگرمیوں پر توکڑی نگاہ رکھی، لیکن اس کے خلاف لب کشائی سے احتراز کیا، پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں کانگریس کے طرز کار سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس میں شرکت سے احتراز کریں۔

سرسید مسلمانوں کے قائد اعظم نہیں تھے۔ وہ اپنی قوم کی مخالفت کا شکار ہو رہے تھے۔ ان پر کفر کے فتوے صادر ہو رہے تھے۔ ان کے خلاف زہر چکانیاں کی جا رہی تھیں، انھیں قوم اور ملت کا غدار کہا جا رہا تھا، ان پر دہریت، الحاد، فسق اور لادینیت کے تیر پھینکے جا رہے تھے، لیکن اپنے ضمیر کا محاسبہ کرنے کے بعد انھیں اطمینان ہو گیا کہ وہ مسلمان ہیں اور عام و خاص مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود حق رکھتے ہیں کہ اپنی قوم کو مفید مشورے دیں اور اسے گڑھے میں گرنے سے بچائیں خواہ انھیں کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے اور ان کی نیت پر کیسے ہی رکیک حملے کیوں نہ کیے جائیں چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے اور اپنی کوتاہیوں کو پورا کرنے میں یکسوئی کے ساتھ مصروف و منہمک رہنے کا مشورہ دیا،

ابھی میں نے عرض کیا ہے وہ مسلمانوں کے قائد اعظم نہیں تھے کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا بول ساری ملت کے لیے ایک فرمان بن جاتا اور وہ بے چوں وچرا اس کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو جاتی، جہاں ان کے مذہبی افکار وخیالات سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت سخت وشدید اختلاف کر رہی تھی، وہاں ان کے سیاسی افکار وخیالات سے اختلاف رکھنے والوں میں بھی بعض مشہور مخلص سربرآوردہ مسلمان نظر آتے ہیں۔

بدرالدین طیبؔ جی

ان مسلمانوں میں سرفہرست مسٹر بدرالدین طیب جی کا نام ہے، جو کانگریس کے تیسرے سالانہ اجلاس ۱۸۸۷ء منعقدہ مدراس کے صدر والا احترام منتخب ہوئے، وہ شروع سے کانگریس کے سرگرم حامی اور نمائندہ طرز حکومت کے سرگرم داعی تھے۔ بمبئی میں کانگریس کا پہلا اجلاس ہرگز منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر بدرالدین طیب جی نے شب و روز ایک کر کے، سرمایہ بہم نہ پہنچایا ہوتا، اور انتظامات نہ کیے ہوتے۔ بمبئی کا یہ اجلاس بہت مختصر نوٹس پر منعقد ہوا تھا۔ اور اتنے کم وقت میں طیب جی کے سوا کوئی بھی، اپنے دوش زبردست پر یہ ذمے داری لینے کو تیار نہیں تھا، وہ ایک خلیق مسلمان تھے۔ انھوں نے اپنی قوم کی تعمیری خدمت بھی جوش وخروش کے ساتھ کی۔ وہ صرف ایک بہترین بیرسٹر ہی نہیں تھے بہت بڑے مدبر بھی تھے، نڈر، دلیر اور بیباک بھی، لیکن بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ وہ شمالی ہند سے بہت دور مغربی ہندوستان۔ بمبئی۔ کے رہنے والے تھے اور یہاں والوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ غدر کے نام سے جو قیامت برپا ہوئی تھی اس نے کس طرح مسلمانوں کو بے بس، مفلوج اور بے سہارا کر دیا تھا۔ کس طرح مسلمان دفعتاً حکمران قوم سے، پسماندہ اقوام کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے۔؟ کس طرح مسلمان، اپنی ہر چیز سے محروم ہو گئے تھے، اور فرنگی عتاب اور جور وستم کا ہدف بن رہے تھے۔؟ وہ سرسید کی مخالفت کا رمز سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور نہ سمجھ سکنے

پر معذور بھی تھے۔

رحمت اللہ سیانی

بدرالدین طیب جی کے بعد کانگریس کے پر جوش داعیوں اور رہنماؤں میں، مسٹر رحمت اللہ سیانی کا نام لیا جا سکتا ہے، یہ کانگریس کے بارہویں اجلاس منعقدہ کلکتہ ۱۸۹۶ء کے صدر منتخب ہوئے۔ طیب جی کی طرح سیانی صاحب بھی، اگرچہ مخلص اور ایثار پیشہ مسلمان تھے، لیکن ہندوستان کے دل۔ شمالی ہند۔ کے حالات و کوائف سے یکسر بے خبر، کانگریس کے حامی، اور نمائندہ حکومت کے داعی، یہ بھی اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ مغربی طرز کی جمہوریت اگر بغیر کسی قید و بند کے ہندوستان میں نافذ کر دی گئی اور نمائندہ حکومت قائم کر دی گئی تو اس کا اثر مسلمانوں کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔ اور وہ کتنے گھاٹے میں رہیں گے۔؟ بلکہ انجام کار کس طرح انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کی غلامی پر مجبور ہو جائیں گے۔

کانگریس کا قیام اور انگریز

بہر حال کانگریس قائم ہو گئی۔ اپنے مسلک پر چلتی رہی اور سید احمد خاں خاموش رہے تیسرے سال انھوں نے مخالفت میں آواز بلند کی۔ شاید اب بھی وہ خاموش ہی رہتے۔ لیکن بجا طور پر وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انگریز کانگریس کو ملک کی غالب ترین اکثریت کو ہموار کرنے اور قابو میں رکھنے کے لیے منجملہ ضروریات تصور کرنے لگے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ کانگریس کا قیام تمام تر حکومت کے اشارے اور ایما کا نتیجہ تھا۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں یہ بات کانگریس کے ایک صدر ڈبلیو سی بنرجی نے اپنے خطبۂ صدارت ۱۸۹۲ء میں ارشاد فرمائی ہے۔ اور ایک دوسرے صدر کانگریس ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے اپنی "تاریخ کانگریس" میں درج کی ہے، اور جس کا تائیدی مقدمہ ایک اور

صدر کانگریس (۱۹۳۴ء) بابو راجندر اپرشاد نے تحریر فرمایا ہے ۔

مسٹر ڈبلو سی، بنرجی فرماتے ہیں :-

"میرے خیال میں یہ بہت سے آدمیوں کے لیے ایک عجیب خبر کی حیثیت رکھے گی کہ انڈین نیشنل کانگریس جواب تک کام کر رہی ہے ۔ دراصل ہندوستان کے شریف گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ مسٹر اے او ہیوم نے ۱۸۸۴ء میں سوچا کہ اگر ہندوستان کے سرکردہ مدبّر اور سیاست دان، سال بھر میں ایک مرتبہ کسی مقام پر اکٹھے ہوں اور عام ملکی حالات و مسائل پر تبادلۂ خیالات کریں، تو یہ اقدام ملک کے لیے حد درجہ منفعت بخش ثابت ہوگا ۔ مسٹر ہیوم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ سیاسیات کو اس میں کسی طرح کا دخل ہو، اور نہ سیاسی امور کو کسی حالت میں بھی وہ موضوع بحث بنانے کو تیار تھے البتہ ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ جس صوبے میں یہ اجتماع ہو، وہاں کا گورنر اس کی صدارت کرے، تاکہ داعی اور رعایا کے تعلقات زیادہ پائیدار اور خوشگوار ہو جائیں ۔"

مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن کی ملاقات

"یہی خیالات تھے جن کے زیر اثر مسٹر ہیوم ۱۸۸۵ء میں شملہ گئے اور لارڈ ڈفرن سے ملے ۔ موصوف نے اس معاملے میں نہایت دلچسپی کا مظاہرہ کیا ۔ آخر کافی غور و خوض کے بعد انھوں نے مسٹر ہیوم سے کہا کہ جس طرح وہ سوچ رہے ہیں ۔ اس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ ہندوستان میں انگلستان کی اپوزیشن پارٹی کی طرح کوئی جماعت نہیں جو عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکے اخبارات بھی قابل اعتبار نہیں اگرچہ وہ عوام کے ترجمان ہونے کے مدعی ہیں ۔ مگر

انگریز بہرحال تاریکی میں ہیں کہ انھیں ہندوستان کی رائے عامہ، اور دانشوروں کے حلقے میں کس طرح یاد کیا جاتا ہے؟ میرے خیال میں حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یہ مفید ہوگا اگر ملک کے سیاستداں سال بھر میں ایک دفعہ آپس میں مل بیٹھیں۔ اور باہمی تبادلہ خیالات کے بعد ان تمام عیوب و نقائص ہم پر واضح کریں جو موجودہ انتظام حکومت میں پائے جاتے ہیں اور یہ بھی بتائیں کہ ان کوتاہیوں اور نقائص کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟"

راز درون پردہ

"لارڈ ڈفرن نے اس خیال سے اختلاف کیا کہ جس صوبے میں یہ اجتماع ہو اس کی صدارت گورنر کرے، کیونکہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی اور بے تکلفی سے اپنے دلی خیالات کا اظہار نہیں کر سکیں گے۔

مسٹر ہیوم نے لارڈ ڈفرن کے خیالات سے اتفاق کا اظہار کیا، اور جب انھوں نے بمبئی، مدراس اور کلکتہ کے سیاست دانوں کے سامنے ہر دو تجاویز رکھیں تو ان حضرات نے کامل اتفاق سے انھیں منظور کر لیا، چنانچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے تگ و دو شروع ہو گئی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے وعدہ کر لیا کہ جب تک وہ ہندوستان کے نائب السلطنت (وائسرائے) اور گورنر جنرل ہیں تو ان کا نام اس اسکیم سے کسی طرح وابستہ نہ کیا جائے۔ مسٹر ہیوم نے وعدہ کر لیا اور پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے وعدے پر قائم رہے۔ چنانچہ چند مخصوص افراد کے علاوہ جو مسٹر ہیوم کے مشیر تھے۔ کسی کو بھی ان پس پردہ واقعات کی خبر نہیں ہونے پائی۔"

اقتباس ذرا طویل ہو گیا لیکن کانگریس کے منظر اور پس منظر کا اس سے زیادہ مستند دستاویزی مواد اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

نتائج فکر

آیئے اب کانگریس کے اس منظر اور پس منظر کا سرسری سا جائزہ لیں

اور معلوم کریں کہ اس کے بین السطور میں جو حقائق مضمر ہیں وہ کیا ہیں۔

۱۔ ایک انگریز مسٹر ہیوم، ایک غیر سیاسی جماعت کے قیام و تشکیل پر غور کر کے ہندوستان کے سب سے بڑے اور با اختیار شخص وائسرائے سے تبادلۂ خیال کرتا ہے کہ یہ "افیون" مناسب رہے گی۔

۲۔ ڈفرن ایک مدبر، ایک سیاست دان، اور ایک دور اندیش شخص ہے وہ محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کی غالب ترین اکثریت کو اگر فی الحال حکومت خود اختیاری نہیں دی جا سکتی، تو کم از کم غیر سرکاری سطح پر اسے حزب اختلاف کی حیثیت تو دی جا سکتی ہے، اس طرح

- دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔
- کچھ زیادہ خطرناک لوگوں کو اعلیٰ مناصب پر فائز کر کے ان کا منہ بند کر دیا جائے گا۔

چنانچہ کانگریس کے کئی صدر اور لیڈر ہائی کورٹ کے جج بنا دیئے گئے۔

- خواص کے ذریعے عوام کے حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔
- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح اکثریت کو ابھرنے کا موقع ملے گا، اور جب کبھی ہندوستان کو آزاد کرنے کا وقت آئے گا تو اس اکثریت کا دل موہ کر اسے مغربی جمہوریت کا نظام سپرد کر دیا جائے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ:۔

اکثریت بہت سی اقلیتوں کو اپنا محکوم اور زیر نگیں دیکھ کر اپنے سابق آقا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیاز مندانہ اور مراعات کا پہلو لیتے ہوئے تعلق قائم رکھے گی۔

۳۔ وائسرائے سے مشورے کے بعد، مسٹر ہیوم نے ہندوستان کے جن سیاستدانوں

سے کانگریس کے قیام کے سلسلے میں گفتگو کی وہ بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے بزرگ تھے۔ ان میں شمالی ہند، دہلی، لکھنؤ، لاہور، پشاور، وغیرہ کا کوئی سیاست داں شامل نہیں تھا۔ اور یہ سب وہ لوگ تھے جنھوں نے غدر کی خبریں سرسری طور پر پڑھی تھیں، اور جو کچھ سنا تھا۔ اسے زیادہ تر مبالغے پر محمول کیا تھا۔ کیونکہ یہ خود غدر کے اثرات و نتائج سے محفوظ رہے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۸۸ء تک مذکورہ مقامات کے علاوہ کسی اور جگہ کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی نہیں ہوا۔ سوا الہ آباد کے جہاں کی سیاست پر بنگالی سیاست داں چھائے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مذکورہ علاقوں کے لوگ، انگریزوں سے متنفر نہیں تھے۔ اور بنگال کے لوگ زیادہ سے زیادہ سرکاری نوکریاں پا رہے تھے اور "ہل من مزید" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ان کے نزدیک سیاسی جماعت کی تشکیل، حزب مخالف کا کردار نمائندہ حکومت کا رفتہ رفتہ قیام، اور مغربی جمہوریت کا تدریجی ارتقا، بڑی دل کشی رکھتا تھا، لہٰذا انھیں مدراس اور بمبئی کے سیاست دانوں کا، ہم آہنگ اور ہم نوا بنانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی تھی۔

۴۔ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم کے ذریعے صرف یہی نہیں کیا کہ کانگریس قائم کی، بلکہ بالکل غیر جانبدار رہ کر، بالواسطہ طور پر اثر ڈال کر موصوف کو اس پر مسلط بھی کر دیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۰۶ء تک یعنی تقریباً ۲۱ سال تک مسلسل، وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری رہے۔ شاید اس کے بعد بھی اس منصب سے وہ چمٹے رہتے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ کانگریس کے قیام کو ان سطروں کے لکھتے وقت اسّی سال کی طویل مدت گزر چکی ہے، اس ساری مدت میں ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی کہ کوئی بڑے سے بڑا

محب وطن بھی اس منصب پر، اتنی مدت کیا۔ اس کی چوتھائی مدت تک بھی فائز رہا ہو۔ آخر کوئی بات تو ہوگی کہ کانگریس ان سے اور وہ کانگریس سے بے نیاز نہ رہ سکے۔

۵ — مسٹر ہیوم کا کچھ ذاتی، اور کچھ بالواسطہ طور پر وائسرائے کی شہ کا یہ اثر تھا کہ کئی سال تک یہ معمول رہا، کہ جس صوبے میں کانگریس کا اجلاس ہوتا وہاں کا گورنر، ایٹ ہوم، ٹی پارٹی یا ڈنر پہ کانگریس کے چیدہ چیدہ مندوبین کو مدعو کرتا، ان کی قدر افزائی کرتا اور ان کا حوصلہ بڑھاتا۔ آخر.... یہ طرز عمل کسی مخصوص جذبے کا غماز تو ضرور ہوگا۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

بہر حال یہ تھی کانگریس کے قیام کی مستند اور دستاویزی تاریخ۔

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

اس تاریخ کی موجودگی میں مسلم لیگ کو جماعت سرکار قرار دینا، اور اس کی تحریک کو "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول کی تاریخ قرار دینا، کیا ستم ظریفی کی انتہا نہیں ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ کانگریس فرنگی سامراج کے مصالح اور ضروریات کی پیداوار ہے، اور مسلم لیگ فرنگی سامراج کی مسلم آزار اور مسلم کش ذہنیت میں ملک کی اکثریت کے والہانہ تعاون کا ردِ عمل ہے، ان دونوں کی ماہیت اور حقیقت سے ناواقف رہتے ہوئے ایک کو سرچشمۂ استقلال حریت قرار دیا، اور دوسری کو، عبودیت اور سجدۂ تعظیمی کا نتیجہ قرار دینا، جہالت بھی ہے اور بے دردی بھی!

عبودیت اور سجدۂ تعظیمی پر خوب یاد آیا کہ کام بھی کانگریس نے اس وقت تک جب تک اس میں انگریزوں سے ٹکر لینے کی استعداد و صلاحیت نہیں پیدا ہوگئی،

بڑی عقیدت اور سعادت مندی کے ساتھ انجام دیا۔

کانگریس کی شان عبودیت پر ایک طائرانہ نظر

آگے بڑھنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کے ابتدائی دور کے سالانہ اجلاسوں کا، ضروری پس منظر کی روشنی میں اختصار کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے، اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک عبودیت اور سجدۂ تعظیمی والی بات ثابت ہو جائے گی دوسرے مسلمانوں کے طرز عمل اور سرسید کے وجوہ اختلاف کی طرف بھی آسانی کے ساتھ ذہن منتقل ہو جائے۔

کانگریس کا پہلا اجلاس پونہ میں منعقد ہونے والا تھا، لیکن وہاں طاعون پھوٹ پڑا، لہٰذا بدرالدین طیب کے جوش کار کی بدولت یہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ مارچ ۱۸۸۵ء میں ایک سرکلر جاری کیا گیا جو یہ تھا:۔

۱۔ یہ کانفرنس (کانگریس) بمبئی، بنگال اور مدراس کے مشہور سیاست دانوں پر مشتمل ہوگی، یعنی شمالی ہند سے کوئی سیاست داں مدعو نہیں کیا جائے گا"!

۲۔ سرکلر میں جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے یہ تھے۔

"یہ اجتماع (کانگریس) ملکی اور قومی پارلیمنٹ کی بنیاد ہوگی، اور چند سال میں اس اعتراض کا مسکت جواب بن جائے گی کہ ہندوستان ابھی تک نمائندہ اداروں کے قابل نہیں ہے۔

ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ، کانگریس کے سابق صدر، گاندھی جی کے دست راست اور تاریخ کانگریس کے مولف اس سرکلر کا ذکر فرمانے کے بعد ایک اور نہایت دلچسپ انکشاف کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"لارڈ ڈفرن سے مشورہ کرنے کے بعد، مسٹر ہیوم، لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی

سر جیمز کیرڈ، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، اور مسٹر سلیگ جیسے مشہور انگریز
مدبرین سے مشورہ کرنے انگلستان تشریف لے گئے، !"

یہ ایک اور ثبوت ہے کانگریس کے زائیدۂ فرنگ ہونے کا، !مسز اینی بسنٹ نے تاریخ کانگریس کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے، پہلے اجلاس کا تذکرہ ایں الفاظ کیا ہے۔

"انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس تو قراردادوں کی بنا پر قابل ذکر ہے، جن میں ہندوستان کے قومی مطالبات کی ابتدا کی جاسکتی ہے"!

ہندوستان کے قومی مطالبات کی ابتدا جن تجاویز سے ہوئی، ان میں سے ایک یہ مطالبہ تھا۔

"ہندوستان کی مجالسِ آئین ساز کے تمام ممبر نامزد ہوتے ہیں، جو ایک غلط طریق کار ہے، ان ممبروں کو عوام کا منتخب کردہ ہونا چاہیئے تاکہ یہ ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکیں!"

کیا یہ مطالبہ مسلمانوں کے کان کھڑے کرنے کے لیے کافی نہیں تھا؟

اب ذرا اس سے پہلے اجلاس کے خطبۂ صدارت کے ایک خاص حصے پر بھی نظر ڈالیئے صاحب صدر نے فرمایا:-

"میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مجمع ہی قوم اور ہر طبقے کی یکساں نمائندگی کرتا ہے، ہم بجا طور پر اقوام ہند کے نمائندے تصور کیے جا سکتے ہیں!"

اس اجلاس کے مندوبین کی تعداد بہتّر تھی، لیکن یہ جملہ اقوام و طبقات ہند کی نمائندگی کے مدعی تھے، اور مغرب کے جمہوری طرز پر نظام حکومت کی تشکیل کے داعی تھے۔

کیا اس دعوے کو قبول کر لینا، اور اس کے مطالبے کو مان لینا، مسلمانوں کی ملی انفرادیت کا خاتمہ نہیں تھا؟ اگر وہ سر جھکا دیتے تو کیا یہ سر ایک قاتل کے سامنے

جھکا ہوا نہ ہوتا جو ان کا وجود ختم کرنے پر تلا ہوا تھا؟ لیکن محض اس خیال سے کہ شاید، یہ حضرات مسلمانوں کے مسائل کی طرف خود رجوع کریں، مخالفت نہیں کی خاموش رہے، حالانکہ اس اجلاس سے کئی سال پہلے، لارڈ ڈفرن کے سامنے مغربی طرز کے نمائندہ نظام حکومت کو وہ مسلمانوں کے لیے حد درجہ خطرناک اور ناقابل قبول قرار دے چکے تھے۔

کانگریس کا دوسرا سالانہ اجلاس بہ مقام کلکتہ ۱۸۸۶ء میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں مندوبین کی تعداد چار سو چھ تک پہنچ گئی۔

صدر کانگریس دادا بھائی نوروزجی تھے، جو انگلستان میں پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے بھی کھڑے ہوئے تھے، اس حوصلے کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے!

لارڈ سالسبری وزیر اعظم انگلستان نے انہی دادا بھائی کو بڑی حقارت سے ایک مرتبہ "کالا آدمی" کہہ کر ان کی عزت افزائی فرمائی تھی، لیکن اس کالے آدمی نے گورے آقا سے حق وفا ادا کیا، اپنے خطبۂ صدارت میں اس نے کہا۔

"حکومت برطانیہ سے تعلق رکھ کر جو فوائد ہم نے حاصل کیے ہیں اور جو شاندار تجاویز (ہماری بہبود کی) ہمارے برطانوی حکام کے پیش نظر ہیں، ان کی قدر و قیمت پر برا اثر پڑے گا، اگر ہم غربت کے دلدل میں پھنستے چلے گئے!"

اس اجلاس میں زیادہ تر گزشتہ تجاویز کا اعادہ کیا گیا، اور ایک مرتبہ پھر بڑے اصرار اور شدت کے ساتھ ملک میں "نمائندہ ادارے" قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ نمائندہ اداروں سے مطلب یہ تھا کہ منتخب مجالس آئین ساز قائم کی جائیں، جہاں مغربی جمہوریت کے مطابق اکثریت کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا، لیکن سرسید کا سکوت اب بھی قائم تھا!

کانگریس کا تیسرا اجلاس بہ مقام مدراس مسٹر بدرالدین طیب جی کی زیر صدارت منعقد ہوا، اس مرتبہ مندوبین کی تعداد اور زیادہ تھی یعنی چھ سو تک پہنچ گئی تھی، جناب صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا :-

"کم از کم میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آسکی کہ کس نے مسلمانوں کو، غیر مذہب ہم وطنوں کے دوش بدوش کام کرنے سے روکا ہے؟"

سرکاری سرپرستی اس اجلاس کے موقع پر بھی قائم رہی چنانچہ گورنر مدراس اس دعوت میں خاص طور پر شریک ہوئے جو کانگریس کے ایک سرکردہ ممبر نے مندوبین کے اعزاز میں دی تھی، صرف اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ گورنمنٹ ہاؤس میں مندوبین کو شرف ملاقات بھی عطا فرمایا۔

بہرحال اب سرسید کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا وہ کھل کر میدان میں آگئے اور انھوں نے کانگریس کی مخالفت شروع کر دی، اس لیے نہیں کہ وہ محب وطن نہیں تھے، یا غلامی پر قانع تھے، یا نمائندہ حکومت کے قائل نہیں تھے، وہ محب وطن بھی تھے، غلامی سے نفرت بھی کرتے تھے، نمائندہ حکومت کے بھی قائل تھے، لیکن اسے بجنسہٖ اور غیر مشروط طور پر قبول کر لینا وہ مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے، وہ حقوق مسلمین کے تحفظ کے ساتھ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں تھے، جس کے لیے کانگریس تیار نہیں تھی، وہ پہلے ہی اجلاس سے جملہ "اقوام و طبقات ہند"۔ کی نمائندگی کی مدعی بن گئی تھی، اور گو ابھی تک وہ عوامی جماعت نہیں بن سکی تھی، نہ ڈیلی گیٹوں کا باقاعدہ انتخاب ہوتا تھا، پھر بھی جو کچھ اور جتنا کچھ بھی حکومت سے مل سکے اس کے لیے اس کا دست طلب دراز تھا، سرسید کے نزدیک اس صورت حال کا برداشت کر لینا مسلمانوں کے محضر قتل پر دستخط کر دینے کے مترادف تھا۔

انجمن محبان وطن کا قیام چنانچہ انھوں نے بہانگ دہل مخالفت شروع

کردی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ۱۸۸۸ء میں "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" (انجمنِ محبانِ وطن) بھی جوابی طور پر قائم کر لی، اس انجمن کے قیام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممالکِ متوسط شمالی و مغربی اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے خلاف جذبات ابھرے، اور انھوں نے مخالفانہ جلسے کر کے اس "کافر" کی تائید کی، یا یوں سمجھیے کہ بڑے کافر کے مقابلے میں چھوٹے کافر کی تائید کی۔

سرسید کے خلاف محاذ

نمائندہ حکومت کے مطالبے میں پیش پیش بنگال تھا، چنانچہ وہاں سرسید کے خلاف باقاعدہ مورچہ قائم ہو گیا، ان پر سب سے بڑا اعتراض بنگال کے حریت مآب اخباروں کا یہ تھا کہ:-

"سرسید ہمیشہ سے نمائندہ طرزِ حکومت کے حامی اور مؤید رہے ہیں ان کی تمام گزشتہ تحریریں اور تقریریں اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وہ آزادی کے بہت بڑے حامی اور علم بردار ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ہیں جو نمائندہ طرزِ حکومت کا مطالبہ کر رہی ہے؟"

ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ سرسید میں کوئی تبدیلی نہیں تھی، ان کا حبِ وطن اور جذبۂ آزادی شک و شبے سے بالا تھا، البتہ وہ اپنی قوم کو، ایک کی غلامی سے نکال کر دوسرے کی غلامی میں دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس ملک کی اکثریت مذہب کی بنیاد پر قائم تھی، لہٰذا مستقل اور دائمی تھی، سیاسی بنیاد پر نہیں تھی کہ اس طرح کی اکثریت کبھی اقلیت اور کبھی اکثریت بن جاتی ہے۔

کانگریس کا چوتھا اجلاس بہ مقام الہ آباد ۱۸۸۸ء میں منعقد ہوا، صاحب صدر نے کانگریس کی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے کہا:-

"حاشا و کلّا ہماری ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ انگریزوں سے تعلقات

ختم کر دیے جائیں، ہماری تمنا تو صرف اتنی ہے کہ ان رشتوں کو جو کشیدہ ہیں ذرا ڈھیلا کر دیا جائے، ہم اس آدمی کی حیثیت اختیار کرنے پر آمادہ ہیں، جسے ضعف بصارت کے باعث عرصۂ دراز تک اندھیرے کمرے میں بند رکھا گیا ہو، ہم یہ نہیں چاہتے کہ پوری روشنی یکایک ہماری نظر کے سامنے لے آئی جائے، تاہم پردے اتنے تو کھسکا دیئے جائیں کہ جس حد تک روشنی ہماری آنکھیں برداشت کر سکتی ہیں کر لیں!"

اس اجلاس میں سرسید کی مخالفت کا ردعمل یہ ہوا کہ کانگریس نے "نمائندہ طرز حکومت" کا مطالبہ اور "جملہ اقوام و طبقات ہند کی نیابت اور نمائندگی کا دعویٰ" اور زیادہ اصرار اور شدت کے ساتھ شروع کر دیا۔

سرسید اور ان کے ساتھیوں نے بھی سکوت اختیار نہیں کیا بلکہ ان کا عمل یہ رہا۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی!

ہندوستان کی قومیت متحدہ اور انگریز

ہندوستان کو مسلمانوں نے فتح کیا، فتح کر لینے کے بعد، اس ملک کو انھوں نے دوسرے فرماں رواؤں کی طرح صرف اپنا مقبوضہ اور مفتوحہ علاقہ تصور کر کے چھاؤنیاں قائم کرنے اور فوجی مراکز قائم رکھنے کی پالیسی اختیار نہیں کی، بلکہ وہ یہاں کے باشندے بن گئے۔ انھوں نے یہاں کی قومیت اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنا ملک — جو اب بھی ان کے قبضے میں تھا۔ جس کے در و دیوار سے، باغ و چمن سے، نہر و دریا سے، موسم اور فضا سے انھیں والہانہ تعلق تھا، چھوڑ دیا۔ اور اس نئے ملک میں آ بسے، جہاں جیسا کہ بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے، نہ باغ تھے، نہ پارک، نہ وسیع اور کشادہ مکان، نہ بلند و بالا عمارتیں، حد یہ ہے کہ جہاں کے لوگ بے سلا لباس پہنتے تھے، جہاں کا موسم حد درجہ گرم تھا۔ اور گرمی کا موسم تو جہنم سے کم نہ تھا۔ جہاں وہ پھل اور میوے بھی نہیں تھے جو اپنے وطن میں بہ آسانی اور بہ افراط دستیاب ہو جایا کرتے تھے۔ اس تنقید اور بجا نکتہ چینی کے باوجود بابر نے مہاجرت اختیار کی، اور دیس چھوڑ کر پردیس کا باشی بن گیا۔

مسلمان بادشاہوں کی روادی

ان مسلمان فاتحوں نے، صرف خاندانِ شاہی کو یہاں کا باشندہ نہیں بنایا۔

بلکہ ان کے ساتھ علماء، فضلاء، شعرا، مشائخ اور اہل علم وادب کی بھی ایک بڑی جماعت آئی اور یہیں رہ پڑی، یہاں کی بود و باش اختیار کرلی، انتہائی اقتدار و اختیار، جاہ و سطوت اور دبدبہ و شوکت کا یہ عالم کہ ہندوستان کے بعید ترین گوشوں تک فتح و ظفر کا پرچم لہرا دیا۔ اور رواداری کی یہ کیفیت کہ دہلی، لکھنؤ، اکبرآباد، آگرہ، عظیم آباد (پٹنہ) اور دوسرے شہروں میں جو مسلح حکومت کے مرکز تھے، مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے، جبری تبدیلی مذہب کی ایک مثال بھی ساری تاریخ میں نہیں ملتی۔

دنیا کے کسی ملک کو بھی فتح کر لینے کے بعد، مسلمانوں نے اپنی تہذیب و تمدن اور علوم و زبان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر، مسلم تہذیب و تمدن کو مفتوح اقوام نے بہ رضا و رغبت اختیار کرلیا اور مسلمانوں کے علوم کو اور زبان کو مقبوضہ ممالک کے باشندوں نے بتدریج قبول کرلیا، لیکن ہندوستان واحد ملک تھا جو اس اصول سے مستثنیٰ رہا۔ یہاں آنے کے بعد مسلمان فاتحین نے، محکوم قوم کی دل جوئی کے لیے اپنی کچھ چیزیں چھوڑیں اور اس کی کچھ چیزیں اختیار کیں، زبان کے معاملے میں بھی ایک عرصے کے غور و فکر کے بعد یہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں جب وہ آئے تھے تو ان کی زبان پر "السلام علیکم" تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد "السلام علیکم" "آداب عرض" "بندگی" "تسلیمات" اور کورنش، میں بدل گیا، یہاں جب ان کا پرچم فتح و ظفر لہرایا تھا، تو ان کی قومی اور سرکاری زبان فارسی تھی، لیکن انھوں نے محکوم قوم کے پاس خاطر سے ایک عرصے کی تگ و دو، سعی و کوشش، اور غور و فکر کے بعد ایک مشترک زبان پیدا کرلی، جو نہ فارسی تھی نہ ناگری تھی۔ جو کسی قوم کی زبان نہیں تھی۔ بلکہ جو دونوں قوموں کا، سر ٹیج بہادر سپرو کے الفاظ میں، ناقابل تقسیم ورثہ بن گئی تھی۔

برصغیر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی

جب تک انگریز پورے طور پر، بلا شرکت غیرے اس ملک کے مالک

نہیں بن گئے۔ نیم دلی، لیکن ظاہری خلوص کے ساتھ وہ بھی اس مشترک زبان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ۱۸۲۹ء میں دہلی کالج" قائم کیا گیا، جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اور علوم جدیدہ سے بہترین کتابوں کے ترجمے اسی لیے کرائے گئے کہ داخل نصاب کیے جائیں۔ ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر کارگل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں تحریر فرمایا:۔

"مشرقی شعبے والا طالب علم (جس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا) اپنے مغربی شعبے والے حریف سے (جس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا) سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔!"

یہی کالج تھا جس کے ممتاز طلبا میں مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ذکاراللہ، مولانا حالی اور پنڈت رام چندر جیسے ماہر علوم و فنون خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لیکن جیسے جیسے انگریزوں کے پاؤں جمتے گئے، مسلمان ان سے بچھڑنے لگے۔ ہندو ان کی خوشامد میں لگ گئے۔ اور ان کی خوشنودی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو گئے۔ انگریزوں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی، اور قدردانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اور مسلمانوں کو پس ماندہ رکھنے میں اُن کی قابلیت اور صلاحیت کے باوجود کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مسٹر بیرنگٹن طامس نے اپنی کتاب، "بغاوت ہند اور ہماری آئندہ پالیسی" میں لکھا تھا:۔

"تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔ ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ ازیں مسلمانوں میں انتظامی صلاحیت بھی زیادہ ہے!"

یہ الفاظ ایک ایسے انگریز کے ہیں جو بنگال سول سروس کا معزز ممبر تھا۔ اور اس کی یہ رائے ذاتی مشاہدے پر مبنی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو دھکے دے کر پیچھے ڈھکیلنے

کی پالیسی انگریزوں کی طرف سے جاری رہی، لارڈ میکالے نے، کلائیو کے بارے میں لکھا ہے

"کلائیو کسی مسلمان کو بنگال کی انتظامیہ کا افسر بنانے پر تیار نہیں تھا۔"

شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ، ان مورخین میں سے ہیں جو غدر سے پہلے اور غدر کے بعد انگریزوں کا دم بھرتے اور ان کی مدح و منقبت کرتے رہے، اپنی معرکہ آرا "تاریخ ہند" کے پانچویں حصے میں انہوں نے ایک مورخ کی طرح سچ سچ لکھا ہے۔

"۸ مارچ ۱۸۰۷ء کے کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ ہندوؤں سے ہمیں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اصحاب نے مشورہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو تقویت دے کر ہندوؤں کو مغلوب کرنا چاہیئے۔ مگر یہ مشورہ ناقابل قبول ہے۔ ہم ایسے کام کیوں کریں جو ہندوستانیوں (ہندو اکثریت) کو ناگوار خاطر ہوں، اور ان لوگوں کے مددگار اور حامی ہوں جو ہمارے قلبی دشمن اور رقیب ہیں۔"

مسلمانوں کے اوقاف کا مصرف

لیکن اس پالیسی کے باوجود مسلمان بطور خود اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کی طرف سرگرمی سے متوجہ رہے صرف بنگال کے مسلمان رؤسا نے جو زمینیں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کی تھیں بقول سر جیمز گرانٹ ان کا تخمینہ صوبۂ بنگال کے رقبہ کے چوتھائی سے کم نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ انڈین سول سروس کے ایک سربرآوردہ ممبر متعینہ بنگال مسٹر ہنٹر نے لکھا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں یہ معافیات تعلیمی انگریزوں نے ضبط کر لیں، حاجی محمد حسن نے ۱۸۰۶ء میں ایک بڑا وقف جو "وقف ہگلی" کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں کے تعلیمی ضروریات کے لیے تھا۔ رجسٹرڈ کرایا، لیکن انگریزوں نے واقف کے منشا اور وصیت کے بالکل برخلاف، وقف کی رقم سے جاری اسلامی درس گاہ کو انگریزی کالج بنا دیا

جس کے بورڈ آف ٹرسٹیز سے مسلمانوں کو بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ جب یہ اسلامی درس گاہ انگریزی تعلیم گاہ کی صورت میں تبدیل ہوئی تو، ہنٹر صاحب کے بقول، اس کے "تین سو طلبا میں صرف تین مسلمان تھے!

غدر کے بعد یہ پالیسی اور واضح ہو گئی، ہنٹر صاحب فرماتے ہیں :۔

"سندر بن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں ان پر ہندوؤں کے سوا کسی اور کا تقرر نہ کیا جائے (اس کا نتیجہ یہ ہے کہ) کلکتے میں مشکل ہی سے کوئی ایسا دفتر ہوگا جس میں بجز چپراسی، چٹھی رساں، یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی ملازمت مل سکے"

انہی ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب (OUR INDIAN MUSALMANS) میں اڑیسہ کے مسلمانوں کی وہ عرض داشت نقل کی ہے جو انھوں نے کمشنر بہادر کی خدمت میں پیش کی تھی :۔

"بہ حیثیت وفادار رعایا حضور ملکۂ معظمہ، ہمیں سرکاری ملازمتیں پانے کا یکساں حق ہے۔ لیکن اڑیسہ کے مسلمان۔ اس طرح پیس دیئے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی ہے۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشے کے اعتبار سے غریب اور سرکاری سرپرستی سے محروم ہماری حالت ان مچھلیوں کی مانند ہیں جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں، مسلمانوں کا یہ حال زار حضور کے سامنے اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ حضور ملکۂ معظمہ کے قائم مقام ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے گا سرکاری ملازمتوں سے اخراج کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجے پہ پہنچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپے ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے

تو ہم دنیا کے دور دراز مقامات تک سفر کرنے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں۔"

پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور انگریزوں کی پالیسی

تقریباً یہی صورت پنجاب کی بھی تھی۔ خان بہادر خورشید احمد خان کا بیان، جو خود بھی محکمۂ تعلیم کے افسرِ اعلیٰ رہ چکے تھے۔ "حکومت خود اختیاری" میں یہ ہے:۔

"مسٹر آرنلڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے محکمۂ مذکورہ کی سب سے پہلی رپورٹ بابت ۱۸۵۶-۵۷ء میں لکھا تھا کہ معلمی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، نقشہ جات سے اسکولوں میں مسلمان بچوں کی بہت زیادہ بیشی ظاہر ہوتی ہے، یہ ایسا میلان ہے جسے بہت زیادہ (سرعت کے ساتھ) روکنے کی ضرورت ہے۔"

سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر کپتان فلر نے اپنی رپورٹ بابت ۶۱-۱۸۶۰ء میں لکھا ہے:۔

"مسلمان استادوں کی بیشی جو ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ بالکل عیاں ہے۔ ۳۳۴ مسلمان استاد اور ۱۱۱ ہندو اور چھ دوسری ذاتوں کے ہیں، افسران ضلع رفتہ رفتہ راستہ صاف کر کے تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ کہ زیادہ ہندوؤں کو ٹریننگ میں جانے کی ترغیب دیں!"

ان رپورٹوں کا تذکرہ کرنے کے بعد خان بہادر صاحب فرماتے ہیں:۔

"اس کے بعد یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک طرف تو مسلمان استادوں کی تعداد گھٹائی گئی۔ دوسری طرف جو (نئے) اسکول اضلاع صدر مقامات

پر قائم کیئے گئے وہ بالکل غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیئے گئے۔ چنانچہ ضلع اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کی فہرست کے مطابق صرف تین مسلمان ہیڈ ماسٹر رہ گئے۔ یہ پالیسی اس قدر کامیاب ہوئی کہ ۲۵ سال کے عرصے میں حالات بالکل بدل گئے، چنانچہ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۰ء تک کے نقشوں میں بالکل واضح ہے کہ معائنہ کنندگان اور اساتذہ سب کے سب ایک مذہب کے لوگ یعنی ہندو ہو گئے، کبھی کبھی مسلمان کا نام شاذ و نادر نظر آجاتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک صوبہ سرحد بھی پنجاب میں شامل اور وہاں ہندو استاد جانا پسند نہیں کرتے تھے۔"

حقیقت یہ ہے کہ غدر سے بہت پہلے اور اس کے بعد پوری قوت کے ساتھ انگریزوں نے "دو قومی نظریہ" پیدا کیا اور ہندوؤں نے پوری سعادت مندی اور خوش اطواری کے ساتھ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ احسانات فراموش کر کے اسے قبول کر لیا۔

تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کو حد سے زیادہ پس ماندہ کر کے اور ہندوؤں کو حد سے زیادہ آگے بڑھا کے مالی اعتبار سے مسلمانوں کو مفلس اور قلاش کر کے اور ہندوؤں کے جیب و دامن زر و گوہر سے بھر کے، سرکاری ملازمتوں کے اعتبار سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نکال کر اور ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھرتی کر کے محکوم مسلمانوں میں بیدردی کے ساتھ احساس کم تری پیدا کر کے اور محکوم ہندوؤں میں دریا دلی کے ساتھ مغربی جمہوریت کی سب سے بڑی نعمت "اکثریت کی حکومت" اور نمائندہ طرز حکمرانی کا جذبہ اجاگر کرتے ہوئے احساس برتری پیدا کر کے غیر محسوس طور پر جب انگریزوں نے دو قومی نظریہ پیدا کر لیا اور اس کی

آبیاری کے لیے کانگریس کو میدان میں لے آئے تو اب دوسرے اہم پہلو پر توجہ مبذول ہوئی۔

اردو کے خلاف حکومت کا قدم

اب جو چیز "متحدہ قومیت" کی شمع سوزاں کی طرف اشارہ کر رہی تھی، وہ اردو زبان تھی، اپنی معلوم و معروف حکمت عملی کے مطابق، انگریزوں نے، اردو کو فنا کرنے کا کام بھی بتدریج کیا، وہ دفعتہً اور بھرپور حملے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ان کے تدریجی عمل کے نتائج و ثمرات دیر سے برآمد ہوتے ہیں لیکن نہایت پختہ اور مضبوط، چنانچہ اردو کے ساتھ بھی یہی کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے ایک سلسلۂ تقریر میں ذکر فرماتے ہوئے جو علامہ سید سلیمان ندوی نے علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی کے موقعے پر، مارچ ۱۹۳۷ء میں ارشاد فرمائی تھی ایک خیال انگیز اور فکر آفریں حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا۔ انھوں نے کہا:-

> "جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے، دور بینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی، جس کا تمدن، جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اسے پھر دو قوموں میں تقسیم کر دیا اور ہندی اردو زبانیں بنا کر ایک کے لیے پنڈت اور دوسری کے لیے منشی یا مولوی رکھ کر سامان درست کر لیا ہندو بھائیوں کے دل میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب وہ مسلمانوں کی حکومت کے دباؤ سے آزاد ہو چکے ہیں تو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہو جانا چاہیئے"

علامہ سید سلیمان ندوی اپنی اس رائے میں منفرد نہیں تھے، مشہور فرانسیسی

محقق اور اردو دوست اہل قلم گارساں دتاسی نے بھی یہی بات ـــــ جس کا ذکر "حیات جاوید" میں موجود ہے ـــ لکھی ہے :-

"ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے، ہر ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے"

جواہر لال نہرو نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، انھوں نے اپنے مضمون "زبان کا مسئلہ" میں لکھا ہے کہ زبان کی اس تبدیلی سے :-

"اول تو ہندو قومیت کا جذبہ پیدا ہوا پھر اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے اردو کو اپنی مخصوص زبان قرار دے لیا، پھر رسم الخط اور عدالتوں نے دفاتر میں اس کے اجرا کے باب میں بحثیں چھڑ گئیں، جس نے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی"

بہرحال دو قومی نظریے کی اس دوسری اہم ترین شق، یعنی اردو تمت بالخیر کے سلسلے میں بھی انگریزوں نے، عملی جد و جہد، آہستگی لیکن تسلسل کے ساتھ شروع کر دی دلی کالج مرحوم ہو گیا، فورٹ ولیم کالج میں، ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں بن گئیں۔ بقول ہنٹر :-

"اس سیلاب کی رفتار ابتدا میں سست تھی، مگر مسلسل بڑھتی گئی، کیونکہ اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلمان فاتحوں کی اجنبی زبان کے بجائے دیسی زبان (بنگالی) میں دفتر رکھا جائے، تب سے ہندوؤں کا غلبہ شروع ہوا اور سرکاری ملازمت کے ہر شعبے میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے۔"

اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں، صوبہ بہار کی حکومت نے اردو زبان کا جنازہ نکالا، اور سرکاری دفاتر میں، اردو کی جگہ کیتھی رسم الخط جاری کر دیا، پھر صوبہ متحدہ

(یا غیر متحدہ ؟) یعنی یوپی نے انگڑائی لی اور ناگری رسم الخط، اور ہندی زبان کی تحریک زور و شور سے شروع ہوگئی، یہی وہ زمانہ ہے جب بادل نخواستہ، سرسید نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، اور اب ان میں کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اردو کا مقدمہ اور محسن الملک کی رہنمائی

سرسید چونکہ اردو کے سب سے بڑے حامی اور پشت پناہ تھے، لہٰذا ان کی زندگی ہیں انگریزوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس مسئلے کو زیادہ طول نہ دیا جائے، لیکن ان کے انتقال کے دو سال بعد ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو یوپی کے لفٹنٹ گورنر سر انٹونی میکڈانلڈ نے فرمان جاری کیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں دیوناگری کا رواج شروع کردیا جائے۔

اب سرسید کے جانشین نواب محسن الملک تھے، وہ یہ زیادتی برداشت نہ کرسکے انھوں نے "اردو ڈفنس ایسوسی ایشن" قائم کی، اور میدان عمل میں اتر آئے۔۔ ۲ مئی کو نواب صاحب کے دولت کدے پر ایک جلسہ جو چیدہ افراد پر مشتمل تھا منعقد ہوا جس میں اصولی گفتگو ہوئی اور ۱۲ مئی کو ایک بہت بڑا جلسہ نواب لطف علی خاں (نواب چھتاری) کی زیر صدارت علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک نے ایک معقول اور مدلل تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"میں نہیں کہتا نہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کوشش کی جائے گی اس میں پوری پوری کامیابی ہوگی مگر اس مقولے کو ہمیشہ یاد رکھو کہ رعایا کی خواہشوں کو (گوش و ہوش سے سننا) ایک دانا اور دانش مند حکومت کا، اور اپنے حقوق کا طلب کرنا، ایک آزاد اور وفادار رعایا کا فرض ہے اور اپنے اس پاک عقیدے کو پیش نظر رکھو کہ "ہمارا کام کوشش کرنا اور خدا کا

کام اسے پورا کرنا ہے"!

"پس ہم سب کو چاہیئے کہ اس کام کو دانش مندی اور استقلال کے ساتھ کریں، اور ایک وفد کے ذریعے ہز آنر، سر انٹونی میکڈانلڈ کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کریں۔ اگر ہم کامیاب ہوئے فبہا المراد۔ اگر ناکام رہے تو ہمارا دل اس خیال سے مطمئن رہے گا کہ ہم نے اپنا حق ادا کیا اور آئندہ آنے والی نسلیں ہماری شکر گزار رہوں گی کہ ہم نے ان کی بہبود کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ پس اے مسلمانو آؤ!۔ اور خدا کے کرم اور گورنمنٹ کے انصاف پر بھروسہ کر کے اس قومی کام میں بلا اس خیال کے کہ تم جیتو گے یا ہارو گے آخری کوشش کر لو تاکہ کہنے کو یہ بات رہ جائے کہ

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا!!"

اس اجلاس میں متعدد تجویزیں منظور ہوئیں ایک خاص تجویز کا اس جگہ ذکر ضروری ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ انتہائی غم و غصے کے موقعے پر بھی مسلمان "ہندو مسلم منافرت" کی پالیسی اختیار کرنے پر تیار نہ تھے، وہ تجویز یہ تھی:-

میمورنڈم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ ملکہ معظمہ کی ہندو رعایا کے فوائد و اغراض کے برخلاف کسی قسم کی حملہ آوری نہ ہو۔ اور نیز کسی قسم کی خصومت انگیز مباحثے جن سے ہندو مسلم مذہبی یا قومی نزاع کا اندیشہ ہو جائز نہ رکھے جائیں"

طے یہ پایا کہ اردو کے حفظ و دفاع کے سلسلے میں ایک جلسۂ عام بہ مقام لکھنؤ منعقد کیا جائے۔

لکھنؤ کا جلسہ اور گورنر کی برہمی

لکھنؤ کا جلسہ منعقد ہونے سے پہلے، ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے بنارس میں ایک

تقریر کی، اور علی گڑھ کے جلسے سے متعلق برہمی اور عتاب کا اظہار فرمایا۔

لیکن نواب محسن الملک ہز آنر کی برہمی سے کچھ متاثر نہیں ہوئے۔ لکھنؤ کے مجوزہ جلسے کی تیاریاں جاری رہیں۔ البتہ نواب لطف علی خاں (چھتاری) چشم عتاب کی تاب نہ لا سکے۔ انھوں نے ہز آنر سے معذرت بھی کر لی۔ اور سنٹرل اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کی صدارت سے استعفا بھی دے دیا۔ انگریزوں کے جاہ و جلال اور کبریائی کے سامنے سینہ سپر ہونے کی جرأت وہ کہاں سے لاتے۔

بہر حال ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ کے مشہور قیصر باغ کی بارہ دری میں، سنٹرل اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کا ایک نہایت شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ صدر جلسہ خود نواب محسن الملک تھے۔ اس جلسے میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے، اور خاص طور پر وکلا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مجمع ہزاروں سے متجاوز تھا۔ جلسے میں بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں۔ ایک تجویز میں ہز آنر سر انٹونی میکڈانلڈ کی بنارس والی تقریر کا جواب بھی دیا گیا۔ جو یہ ہے :-

"اس جلسے کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ سر انٹونی میکڈانلڈ نے فرمان مورخہ ۸ اپریل ۱۹۰۰ء دربارۂ نفاذ دیوناگری کسی فریق کی طرف داری یا دانستہ اہل اسلام کو ضرر پہنچانے کی نیت سے صادر کیا ہے، لیکن یہ جلسہ ہز آنر کی رائے اور فیصلے سے اتفاق کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔"

محسن الملک کی معرکہ آرا تقریر

اس کے بعد محسن الملک نے ایک معرکہ آرا اور یادگار تقریر کی۔ انھوں نے کہا :-

"گو ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں۔ اور ہمارے قلم میں زور نہیں۔ اسی وجہ سے ہم سرکاری دفتروں میں کم نظر آتے ہیں، مگر ہمارے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی طاقت ابھی باقی ہے۔ (چیرز) ہمارے دل میں ملکہ معظمہ کی

محبت ہے، اور ان کی حکومت کی برکتوں پر ہمیں یقین ہے۔ اس حکومت کی بدولت ہم اپنی سلطنت کے جانے کے بعد اپنا وجود ہندوستان میں دیکھتے ہیں اور آزادی و امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ بس گو قلم سے کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر خدانخواستہ جب مغرب سے ہم کسی کو اس حکومت کے مقابلے میں آتے دیکھیں گے تو ملکۂ معظمہ کے تاج اور سلطنت پر اسی طرح اپنا خون بہائیں گے جیسا اپنے ہم مذہب بادشاہوں کی بادشاہی قائم رکھنے کے لیے بہاتے تھے، (پر جوش چیئرز) مجھے ہرگز یقین نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہماری زبان کو مرنے دے گی۔ بلکہ اس کو زندہ رکھے گی۔ اور وہ کبھی مرنے نہیں پائے گی، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو کوشش اس کے مارنے کی دوسری طرف سے ہو رہی ہے اگر وہ برابر جاری رہی تو آئندہ کسی وقت ہماری زبان کو صدمہ پہنچے گا۔ یہی خوف ہے جس کے لیے یہ کوششیں ہو رہی ہیں، تاکہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ وہ وقت آئے کہ اسے زندہ نہ رکھ سکیں تو اس کا جنازہ تو دھوم دھام سے نکالیں۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

اس تقریر میں نواب محسن الملک نے نواب لطف علی خاں کے استعفےٰ کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا:-

"جب کسی مسئلے کے متعلق تمام قوم کو صدمہ پہنچے تو اس کے متعلق ایجی ٹیشن پھیلانے اور برانگیختہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، ایسے وقت میں ہمارا فرض یہ ہے کہ پبلک کی رائے کو اعتدال پر لائیں، باوجود اس کے کہ ایسے بڑے شخص جیسے ہمارے مستعفی پریسیڈنٹ ہیں اس تحریک

سے علیحدہ ہو گئے، یا بڑے بڑے نواب اور رئیس خیالی خوف سے شریک نہیں ہوئے۔ ہم کو یقین ہے کہ ہماری زبان مرنے نہیں پائے گی اور ہمیشہ زندہ رہے گی!"

محسن الملک پر عتاب

اس تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا، ہنٹر آنریبل کی برہمی اور بڑھ گئی۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری نے ایک خط مسٹر ماریسن پرنسپل کے نام بھیجا۔ اور درخواست کی کہ اسے ٹرسٹیوں میں گشت کرا دیا جائے۔ موصوف نے لکھا تھا:-

"ہنٹر آنر کا خیال ہے کہ یہ امر ٹرسٹیوں کے معتمد نمائندے کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک باضابطہ ایجی ٹیشن کے بانی ہوں جو حکومت کے ایک فیصلے کے برخلاف کیا گیا ہو، ہنٹر آنر کو یقین کامل ہے کہ اکثر ٹرسٹی اس کو پسند نہیں کریں گے۔ جس کے باعث بلاشبہ بعض ٹرسٹی مشکوک ہو گئے ہیں۔"

ہنٹر آنر محسن الملک سے اتنے خفا ہوئے کہ اب ان کا خطاب بھی انھیں کھٹکنے لگا، حالانکہ ۱۸۸۷ء میں ہز اکسی لینسی گورنر جنرل نے اس کو تسلیم کیا تھا، اور سرکاری مراسلت اور حکام انگریزی کی خط و کتابت میں اس کے استعمال ہونے کی اجازت دے دی تھی، لیکن ہنٹر آنر نے اس فیصلے کو قائم نہیں رہنے دیا اور اس کا استعمال سرکاری طور پر گوارا نہیں کیا، وجہ یہ بتائی کہ حیدرآباد کا خطاب ترک ملازمت کے بعد برٹش انڈیا میں قابل تسلیم نہیں ہے۔

محسن الملک کا استعفا

آخر حالت یہاں تک پہنچی کہ محسن الملک کے لیے علی گڑھ محمڈن کالج کی سکریٹری شپ یا اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کی معتمدی سے کسی ایک کو منتخب کر لینے کا سوال پیدا ہو گیا۔ نواب صاحب

نے دونوں سے استعفا دے دیا، لیکن اسی اثنار میں سر جیمس لاٹوش لفٹیننٹ گورنر ہو کر آ گئے۔ اور سر انٹونی میکڈانلڈ رخصت ہو گئے۔ یہ نسبتاً وسیع القلب آدمی تھے۔ انھوں نے محسن الملک کو کالج سے مستعفی نہیں ہونے دیا اور ان کا استعفا نامنظور کرا لیا، اور سکریٹری کے منصب پر فائز رکھنے میں عملی حصہ لیا۔ مگر سنٹرل اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کی معتمدی گئی۔ معتمدی کیا گئی، خود یہ انجمن وفات پا گئی۔

"البشیر" اٹاوہ کے ایڈیٹر مولوی بشیرالدین، سرسید کے معاصر تھے، جن کا سو سال سے زیادہ کی عمر میں، چند سال ہوئے انتقال ہوا ہے، انھوں نے محسن الملک اور انٹونی میکڈانلڈ کی آویزش سے متعلق اپنے اخبار میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"اردو ڈفنس ایسوسی ایشن درحقیقت اس وجہ سے بند ہوئی کہ سر انٹونی میکڈانلڈ بہ حیثیت پیٹرن محمڈن کالج کے علی گڑھ آئے۔ انھوں نے ٹرسٹیوں کو جمع کر کے اس ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کے ذریعے کی جاتی تھی، سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ اور یہ الزام لگایا کہ کالج کے طلبہ ایجی ٹیشن کے لیے بھیجے گئے۔ کالج کے اساتذہ اور بعض ٹرسٹیوں نے، اور نواب محسن الملک سکریٹری نے اس میں نمایاں حصہ لیا، اگر یہ طریقہ جاری رہا تو گورنمنٹ سے جو امداد کالج کو ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی۔ بعض ٹرسٹیوں نے سر انٹونی کی خوشامدانہ تائید کی اور تمام تر الزام نواب محسن الملک پر لگایا، نواب محسن الملک کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ سکریٹری شپ سے استعفا دے دیں، یا اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کی پریسیڈنسی سے، چنانچہ انھوں نے اردو ڈفنس ایسوسی ایشن کی پریسیڈنسی سے استعفا دے دیا، اس پر قومی اخبارات میں ان کے خلاف سخت نکتہ چینی کی گئی، غرض کہ سر انٹونی میکڈانلڈ نے پوری قوت سے

کام لیا کہ اردو ڈفنس ایسوسی ایشن بند ہو، بیرسٹروں اور وکلاء میں بھی زیادہ حصہ ٹرسٹیان کالج کا تھا، وہ اس خوف سے کہ سر انٹونی کالج کی امداد بند کردیں گے خاموش ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈفنس ایسوسی ایشن بند ہو گئی۔!"

اس راز درون پردہ کے انکشاف و اعلان کے بعد مولوی بشیر الدین نے مزید تحریر فرمایا:

"تاہم سر انٹونی کی مخالفت زبان اردو، اور نیز مسلمانوں کو ملازمت نہ دینے کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور اسی وقت پولٹیکل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی بحث قومی اخبارات میں شروع ہو گئی، جس کا نتیجہ (بعد میں) مسلم لیگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔!"

مولوی بشیر الدین مرحوم کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے، اس پر آگے چل کر نئے باب میں ہم گفتگو کریں گے۔

خلاصۂ مباحث

اس باب میں جو واقعات و حقائق پیش کیے گئے ہیں ان سے چند باتیں بہت واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتی ہیں!

۱۔ مسلمانوں نے غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو "قومیت متحدہ" کے آبگینے کو چور چور کر دینے والی ہوتی، انھوں نے اپنی روایات کے بالکل برعکس اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں اور دور غلامی میں پورے اخلاص کے ساتھ قومیت متحدہ کے تصور کو عملی جامہ پہنایا۔ اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی ممکن تھا وہ کر گزرے۔

۲۔ انگریز مسلمانوں سے خائف اور ہندوؤں سے مطمئن تھے، مسلمانوں سے اس لیے خائف تھے کہ ان سے حکومت چھینی تھی۔ اور یہ دھڑکا لگا تھا۔ کہ کہیں یہ چنگاری پھر فروغ جاوداں نہ حاصل کر لے۔ اور ہندوؤں سے اس لیے مطمئن تھے کہ وہ خوئے غلامی

میں پختہ تر تھے۔ اور ان کی سلطنت کے قیام میں جوش اور خلوص کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ لہٰذا انگریزوں نے پالیسی یہ بنائی کہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کچلا جائے اور ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ نوازا جائے۔

۳۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دور رکھنے کی تدبیر یہ اختیار کی کہ نفرت انگیز نصابِ تعلیم تیار کیا۔ اور ہندوؤں میں قومی انفرادیت کا جذبہ ابھارا۔ جس کی سب سے زیادہ جذبات انگیز صورت زبان کی تفریق تھی۔

۴۔ ہندوؤں نے انگریزوں کا ساتھ اس لیے دیا کہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا انگریز ایک نہ ایک دن جائیں گے اور جب بھی جائیں گے۔ اکثریت کی حکومت قائم کر کے جائیں گے۔ جس کے صاف معنی یہ تھے۔ کہ انگریزوں کے وارث اور جانشین وہ ہوں گے۔ مسلمان جس طرح انگریزوں کے لیے خطرناک تھے ہندوؤں کے لیے بھی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا دو قومی نظریے کی تائید اور مسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی میں انھوں نے انگریزوں کا ساتھ بڑی سچائی کے ساتھ دیا اور اپنے اس فرض سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے۔

نواب وقار الملک

مسلمان کچھ عجیب طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کا معاملہ غالب کے الفاظ میں یہ تھا :-

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

وہ ۳۲ دانتوں میں ایک زبان ہو رہے تھے، جس سرزمین پر ایک ہزار سال تک جاہ و حشم کی زندگی انھوں نے بسر کی تھی آج وہاں کی زمین انھیں نگلنے کو تیار تھی۔ آسمان ان پر ٹوٹ پڑنے کو آمادہ تھا۔ در و دیوار ان کے مخالف تھے، کہیں پناہ کا ٹھکانا نہ تھا، کہیں سے امداد کا آسرا نہ تھا، اور انگریز مسلمانوں کے دشمن جان تھے۔

انگریز اور ہندوؤں کی دل جوئی

ہندو انگریزوں کے ساتھ تھے، اور مسلمانوں کے برباد کرنے میں ان سے پورا تعاون کر رہے تھے، انگریز ان کی دل جوئی پر دو وجوہ سے مجبور تھے، ایک تو اس لیے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان پر کہیں زیادہ اعتماد کیا جا سکتا تھا، دوسرے جس نظام حکومت کے زیر سایہ انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ اس میں اکثریت ہی سب کچھ تھی، اور ہندو اس سرزمین پر غیر معمولی اکثریت کے حامل تھے، ہندوؤں کے

علاوہ دوسری اقلیتیں جو تھیں انھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ جو بھی برسرِ حکومت ہو اس کے گن گائیں نہ انھیں انگریزوں کی حکومت سے پرخاش تھی، نہ مستقبل کی ہندو حکومت سے کوئی خطرہ تھا۔

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

مسلمان دکھ تکلیف اور اذیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ہندو ان کے احسانات فراموش کر چکے تھے، اور انگریز ان کی نیازمندی کو ٹھکرا رہے تھے، سیاست سے الگ رہ کر اور تاجِ برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کر کے انھوں نے اپنے حال اور مستقبل کو محفوظ سمجھ لیا تھا، لیکن چونکہ وہ دیکھ رہے تھے، اسے نظر انداز کس طرح کر دیتے۔؟

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؟

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا !

مسلمانوں نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا۔ مگر ان کا سینہ تیروں سے چھلنی ہوتا رہا ہندو، نیابتی اور نمائندہ حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور انگریز شفقت و محبت کے ساتھ اس مطالبے کو شرفِ پذیرائی بخش رہے تھے۔، ہندوؤں نے یک لخت اس زبان سے اظہارِ نفرت شروع کر دیا۔ جس کی تخلیق و تشکیل میں ان کا بھی حصہ تھا اور جسے وہ گھروں میں بولتے تھے اور کتابوں میں لکھتے تھے۔ اب ہندوؤں کے حسبِ فرمائش، ایک نیا رسم الخط (دیوناگری) اور ایک نئی زبان (ہندی) ان پر مسلط کی جا رہی تھی، یہ دونوں باتیں ان کے لیے پیامِ موت سے کم نہ تھیں۔

نمائندہ اور نیابتی طرزِ حکومت کے اجرا کا مطلب تھا اقلیت کے نام پر مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں دے دینا، اور اردو کے انتقال پر ملال کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ، وہ مشترک تہذیب جو ایک ہزار سال کی لگاتار جدوجہد کے بعد وجود میں آئی تھی ختم ہو جائے، اور مسلمان، ہندو تہذیب و تمدن اختیار کر لیں۔

اس صورت احوال کے خلاف ادب و احترام کے جملہ آداب و اصول ملحوظ خاطر رکھ کر احتجاج کیا تو مورد عتاب قرار پائے، ذلیل کیا گیا۔ تعلیمی امداد بند کر دینے کی دھمکی دی گئی، حالانکہ . . . . کانگریس کے ہر اجلاس میں دھواں دھار تقریریں، برطانوی سامراج کے خلاف ہوتی تھیں، اظہار وفاداری کے ریزولیوشن کے بعد جتنے ریزولیوشن منظور ہوتے تھے، ان سب کی تان، حکومت خود اختیاری پر آکر ٹوٹتی تھی، مگر وہ محبوب تھی، اس کے خلاف کسی طرح کا اقدام نہیں کیا گیا۔

محسن الملک نے اردو ڈفنس ایسوسی ایشن سے استعفا دے دیا، لیکن وہ ان حقائق سے آنکھیں کیسے بند کر سکتے تھے، جو مشاہدے کی صورت میں جلوہ گر تھے، ملازمتوں میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں تھا، حکومت کے ایوان میں ان کی آواز کوئی وزن نہیں رکھتی تھی، احتجاج و اضطراب اور مظاہرے، نفرت اور حقارت کے ساتھ رد کر دیئے جاتے تھے۔

پھر آخر وہ کیا کریں۔؟

کیا اس صورت حال کو برداشت کر لیں۔؟

کوئی قوم جو پہلی مرتبہ غلام ہوئی ہو اتنی بے حس تو نہیں ہو سکتی کہ اپنے مخفر قتل پر خود ہی دستخط کر دے،!

اردو مٹ جائے بلا سے، لیکن مسلمان تو نہ مٹیں، لیکن اگر ان کے سیاسی حقوق پر اسی طرح دست درازی ہوتی رہی تو ان کا مٹ جانا بھی یقینی ہے۔ سروش غیب پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،!

آخر کار فہم و فکر رکھنے والے مسلمانوں میں، سیاسی تنظیم کا احساس پیدا ہوا ۹ اپریل ۱۹۰۱ء کے پانیر، میں نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کا ایک مکتوب

شائع ہوا، جس کا عنوان تھا "مسلمان اور کانگریس" نواب صاحب نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:-

"سرسید کانگریس سے اس لیے الگ نہیں تھے کہ مسلمان خاموش ہوکر اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنے ضروریات و مطالبات جداگانہ طور پر حکومت کے سامنے پیش کریں، حکومت کے ایوان میں سرسید کی وقعت بھی تھی، اور رسائی بھی، اب کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ان کے پائے کا ہو اس لیے ایک ایسی سیاسی جماعت قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جو حکومت کے سامنے مسلمانوں کے ضروریات و مطالبات پیش کر سکے، اور اپنے حقوق حاصل کرے۔!"

نواب محسن الملک اتنے سہمے ہوئے تھے کہ نہ صرف یہ کہ انھوں نے سکوت نہیں اختیار کیا بلکہ اس کی مخالفت کی۔ لیکن نواب وقار الملک ان کے مقابلے میں زیادہ دبنگ آدمی تھے۔ انھوں نے محسن الملک کی مخالفت کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"بے شک کانگریس میں مسلمانوں کا شریک ہونا خودکشی ہے، لیکن اگر حق تلفیوں سے مایوس ہوکر مسلمان خودکشی پر اتر آئیں تو یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ مسلمانوں کو اگر کانگریس سے الگ رکھنا ضروری ہے تو یہ بھی (بہت زیادہ) ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت بنائی جائے۔"

علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن، بلاشبہ مسلمانوں کے ہمدرد تھے، لیکن مسلمانوں سے پہلے اپنی قوم کے ہمدرد تھے، انھیں بھی یہ گوارا نہ تھا کہ مسلمان سیاست کے میدان میں آئیں، اور سیاسی تنظیم قائم کریں، چنانچہ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اگست ۱۹۰۱ء) میں ایک مضمون ناصح مشفق کی حیثیت سے قلمبند فرمایا۔ اور مسلمانوں

کو "خودکشی" سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ محسن الملک ان کے خلاف جانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی آمنا وصدقنا کہنا شروع کر دیا۔

سر بیندر ناتھ بنرجی

ادھر تو یہ حالت تھی کہ مسلمانوں کو خودکشی سے روکا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف ہندوؤں کی گرمیٔ سخن کو مسکرا مسکرا کر برداشت کیا جا رہا تھا۔

اس نظر بائی جنگ کے تھوڑے ہی عرصے بعد، احمد آباد میں کانگریس کا جو سالانہ اجلاس ہوا۔ اس کے صدر سر بیندر ناتھ بنرجی تھے۔ انھوں نے ایک آتشیں خطبۂ صدارت پیش کیا، فرمایا:

"ابھی تو ہم سفر میں ہیں، منزل مقصود دور اور مسافت طویل ہے، ہم میں سے بہتیرے کنعان تک نہ جا سکیں گے۔ کچھ برگزیدہ لوگ راستے ہی میں رہ گئے ہیں۔ اور بہت سے رہ جائیں گے، سفر طویل ہے اور رات اندھیری، نہ جانے کب صبح امید طلوع ہو، اور قدم منزلِ مقصود پر پہنچیں، البتہ ہمارا ایمان مضبوط ہے، امید و آرزو کا شعلہ ہمارے دل میں روشن ہے۔ اور وہ ہمیں مایوس نہیں ہونے دے گا ہمارا ایمان اس طرح کا ہے۔ جیسا پیغمبروں کا ہوتا ہے، ہم تمام مشکلات کو (ہنسی خوشی) برداشت کریں گے، ہم مردانہ وار قربانی پیش کرتے جائیں گے۔!"

اور آگے چل کر اس خطیب شعلہ نوا نے کہا،

"سیاسی آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے، میرا تو یہ خیال ہے کہ کانگریس خدا کی طرف سے مامور ہے۔ وہ ہمارا دھرم ہے اور اس سے اچھا دھرم کوئی اور نہیں ہے، اصلی دھرم تو مادر وطن کی خدمت، اور اس پر

جان کا قربان کر دینا ہے !"

انگریز ہندو سازباز کے متعلق بار بار جو میں زور دیتا رہا ہوں اس کا ایک ثبوت سر بیندر ناتھ بنرجی بھی ہیں، کانگریس کو اس وقت تک یہ دھرم سمجھتے رہے جب تک مسلمان اس سے دور تھے، بعد میں جب مسلمانوں نے کانگریس میں شرکت کی، اور ہندوؤں سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا تو سر بیندر ناتھ بنرجی کانگریس سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے حکومت برطانیہ سے "سر" کا خطاب قبول کر لیا اور گورنر بنگال کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر یعنی وزیر ہو گئے اور مرتے وقت تک کٹر فرقہ پرست رہے۔ مگر کانگریسی حلقوں میں فرقہ پرستی کے باوجود ان کا وقار و احترام کم نہ ہوا۔ وہاں یہ ہمیشہ ممدوح و محبوب رہے۔ کانگریس کے مورخ ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ نے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہندوستان کے سیاست دانوں میں سر بیندر ناتھ بنرجی کی روح ابھی تک زندہ ہے۔ اور ملک کے حالات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ !"

غرض ایک طرف ہندو انگریز محاذ، متحدہ طور پر مصروف کار تھا، دوسری طرف یہ دونوں الگ الگ مسلمانوں کے خلاف مصروف عمل تھے۔ لالہ لاجپت رائے جو کسی زمانے میں آزادی کے ستون، اور کانگریس کے مرد بزرگ تھے، اور آخر میں سر بیندر ناتھ کی طرح وہ بھی بدترین فرقہ پرست بن گئے تھے۔ اپنی کتاب: "UNHAPPY INDIA" میں سر جان مینارڈ سابق ایگزیکٹیو کونسلر پنجاب کا قول نقل کرتے ہیں:۔

"ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی"!

لیکن موصوف نے یہ نہیں فرمایا کہ اس مخالفت و منافرت کی تخلیق میں دونوں برابر کے شریک تھے، انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو زیادہ سے

زیادہ بھڑکایا، اور ہندوؤں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے گزشتہ روایات اتحاد سے قطع تعلق کر لیا۔

سر ہنری ایلیٹ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے وہ حکومت ہند کی وزارت خارجہ کے با اقتدار سکریٹری بھی تھے اور ایک نکتہ سنج مورخ بھی ۱۸۴۹ء میں ان کی مشہور زمانہ تاریخ ہند شائع ہوئی اس زمانے تک ہندو مسلمانوں سے پورے طور پر برگشتہ نہیں ہوئے تھے۔ اور ماضی سے جو روایات انھیں ورثے میں ملے تھے ان کا خیال رکھتے تھے۔ ایلیٹ کو یہ صورت سخت ناپسند تھی اپنی تاریخ کے دیباچے میں اپنے جذبۂ دروں کا مضطرب الفاظ میں وہ اس طرح اظہار کرتے ہیں:۔

"بڑی حیرت ہندو مصنفین پر ہوتی ہے جو اب تک ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک لکھتے، اور اپنی تحریروں کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں"!

پھر آگے چل کر تحریر فرمایا ہے:۔

"اب کہ ہندو اپنے ظالم (مسلمان) آقاؤں سے نجات پا چکے ہیں اور بغیر روک ٹوک کے دل کی بات زبان پر لا سکتے ہیں۔ تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے کوئی طویل زمانۂ مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا"

جب تک اردو کا قضیہ نہیں کھڑا ہوا تھا اور نیا یتی حکومت کا اکثریت کی بنیاد پر آزاد ہند مطالبہ شروع نہیں ہوا تھا، سرسید کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، وہ قومیت متحدہ پر سخت عقیدہ رکھتے تھے ان کی وفات پر کچھ عرصے بعد، ان کا جو "مجموعۂ لیکچرز" شائع ہوا تھا۔ اس میں سرسید کا ایک یہ لیکچر بھی نظر سے گزرتا ہے:۔

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ جو اس ملک کے رہنے والے ہیں، ایک قوم ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں۔!"

ایک اور موقعے پر انھوں نے کہا:-

"جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں!"

جب پنجاب کا دورہ سرسید نے کیا تو ایک جلسے میں ہندوؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:-

"آپ نے جو لفظ 'ہندو' اپنے لیے بولا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں، کیونکہ ہندو کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا رہنے والا ہر شخص اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو، باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے!"

ہندو مسلم اتحاد پر بھی سرسید کا غیر متزلزل عقیدہ تھا، اس کے بغیر ملک ترقی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اسی جلسے میں، سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:-

"ہم نے متعدد مرتبہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں، اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت اور برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوب صورت دلہن بھینگی ہو جائے گی، اور

اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی ۔!"

سرسید کے ان خیالات سے ان کے انگریز دوست بھی واقف تھے، چنانچہ انھوں نے ۱۸۶۷ء میں جب بر سبیل گفتگو اردو کے خلاف ہندوؤں کو مصروفِ پیکار دیکھ کر دلی تاسف کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندو مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو وہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے ۔

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے انگریزوں کو خوش رکھنے، اور ہندوؤں کو رام کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جب موت اپنے سامنے کھڑی دیکھ لی تب ان میں قومی انفرادیت کے تحفظ اور بقار کا جذبہ پیدا ہوا — کامل تہرین مایوسی کے بعد !

داغؔ نے خوب عاشقی کا مزا جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا!!

وقار الملک میدان عمل میں

بہر حال محسن الملک کو متذبذب اور متامل دیکھ کر نواب وقار الملک آگے بڑھے اب تک مسلمانوں کی جملہ تعلیمی، نیم سیاسی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ رہا کرتا تھا۔ محسن الملک اور مارلین صاحب کا رویہ دیکھ کر، وقار الملک نے ۲۱ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک جلسہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا کی کوٹھی پر لکھنؤ میں طلب کیا۔ صدر جلسہ سید شریف الدین بیرسٹر ایٹ لا تھے، جو بعد میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بنے ۔ جلسے کے اغراض و مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے وقار الملک نے کہا :-

"تمام ملک ہندوستان میں کچھ عرصے سے مسلمانوں کا درجہ روز بروز متنزل کرتا جاتا ہے، اور خاص خاص صوبوں میں بھی ان کے حقوق پر حملہ ہو رہا ہے"

اس کے بعد وقار الملک نے اردو ہندی کی آویزش اور سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کی حد درجہ قلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

" وائسرائے کی قانونی کونسل اور صوبائی کونسلوں میں بھی مسلمان ..... اپنے انتخاب سے ممبر نہیں بھیج سکتے ۔"

محمڈن پولٹیکل آرگنائزیشن کا قیام

اس کے بعد وقار الملک نے سیاسی تنظیم ملی سے متعلق ایک اسکیم پیش کی، یعنی کہ :

" مسلمانان ہند تمدنی اور سیاسی معاملات کے لیے ایک جماعت قائم کریں، جو اپنے ضروریات و مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرے، کانگریس میں چونکہ نیابتی حکومت، اور امتحانات مقابلہ کے اجرا کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو مسلمانوں کے لیے مضر ہے ! "

اس تقریر اور توضیح کے بعد ۱۹۰۱ء کے آخر میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت " محمڈن پولٹیکل آرگنائزیشن " کے نام سے عالم وجود میں آگئی ۔

نواب وقار الملک نے پیرانہ سالی کے باوجود اس جماعت کی تنظیم اور اس کی شاخیں قائم کرنے کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا، اور مختلف شہروں میں اس کے اغراض و مقاصد بیان کر کے مسلمانوں کو اس جماعت میں شرکت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ۔

۲۶ جولائی ۱۹۰۳ء کو " محمڈن پولٹیکل آرگنائزیشن " کا ایک جلسہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی صدارت میں بہ مقام علی گڑھ منعقد ہوا ۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے ایک عالی دماغ مدبر اور سیاست داں کی حیثیت سے فرمایا :-

"مسلمانوں میں یہ خوف پیدا ہوگیا ہے کہ ہر سیاسی تحریک میں شریک ہونے سے حکومت ناراض ہوجاتی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ایسے پرامن جلسے کرنا جیسا کہ یہ ہے، حکومت کی بدخواہی نہیں، عین خیر خواہی ہے!"

نواب محسن الملک نے اس آرگنائزیشن میں سرگرم حصہ تو نہیں لیا۔ لیکن ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک رہے۔

کانگریس کی شعلہ نوائی

مسلمانوں کے ڈرنے اور سہمگیں ہونے کا تو یہ حال تھا کہ وہ "پرامن" سیاسی جلسے میں بھی شرکت کرتے اور حصہ لیتے ہوئے ڈرتے تھے، اور ٹھیک اسی زمانے میں لال موہن گھوش کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بہ مقام مدراس ۱۹۰۳ء منعقد ہوا، ذرا خطبۂ صدارت کے تیور دیکھیے:۔

"کیا کوئی حکومت انگلستان، فرانس، یا امریکہ میں اس قدر بے دردی سے روپیہ خرچ کرسکتی ہے اور وہ خالص دکھلاوے کے لیے خصوصاً جب کہ ملک میں غربت ہو۔ اور ملک الموت بہ آواز دہل پکار رہا ہو اور حکومت تماشائی بنی یہ منظر دیکھ رہی ہو۔ عوام کا یہ حال ہے کہ ہیں تو سب سے غریب، لیکن ٹیکس کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں، اور حکومت بے دھڑک روپیہ (فضول) خرچ کر رہی ہے، اگر بدامنی نہیں، خانہ جنگی نہیں، راجہ اور سردار آپس میں برسرِ پیکار نہیں تو کیا ہوا؟ لوگ جنگ میں ہلاک نہ ہوئے تو کوئی مضائقہ نہیں، قحط اور بھوک سے تو لاکھوں مرگئے!"

کانگریس کا یہ دم خم، اور محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کا یہ حال کہ نہ سامعین ملتے ہیں، نہ مقررین، نہ معاون اور مددگار، اس درجہ انگریزوں نے مسلمانوں کو دہشت زدہ اور ہندوؤں کو بے باک بنا دیا تھا۔

کانگریس کے اس اجلاس میں جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ بھی بڑے معرکے کی تھیں۔

یاد رہے یہ لارڈ کرزن کا زمانہ تھا، کرزن جیسا دبدبے اور طنطنے کا وائسرائے ہندوستان میں (لارڈ ولنگڈن کے سوا) کوئی نہیں آیا۔ اسی کرزن کے عہد میں کانگریس نے جو تجویزیں منظور کیں، ان میں سے ایک میں "یونی ورسٹی بل" شائع کردہ حکومت ہند پر سخت اور تند لہجے میں نکتہ چینی کی گئی اور مخالفت کی بنیاد یہ تھی کہ :-

"اس بل کے پاس ہونے سے یونی ورسٹیوں کی آزادی سلب ہو جائے گی!"

ایک اور بل کا مسودہ حکومت کی طرف سے شائع ہوا تھا کہ سرکاری راز کا افشا، جرم قابل سزا ہے۔

اس بل کو "پبلک مفاد کے منافی" اور "انفرادی آزادی میں مداخلتِ بے جا" قرار دیا گیا۔ اور اس کی مخالفت میں زوردار تقریریں دھوم دھام سے ہوئیں۔

ان تجاویز کے خلاف کانگریس نے جو لب و لہجہ اختیار کیا، اور جو گل افشانیاں کیں۔ وہ آج ۶۳ سال گزر جانے کے بعد ممکن ہے کہ غیر معمولی نہ معلوم ہوں، لیکن ذرا دیر کے لیے، آج سے ۶۳ سال پہلے کی فرنگی قاہریت، استبداد اور سطوت کا تصور کیجئے، اور ان چیزوں میں لارڈ کرزن کا ذاتی جاہ و جلال بھی شامل کر لیجیے۔ پھر سوچیے کہ آزادئ گفتار کی کیا یہ انتہا نہیں تھی جو انگریزوں نے ہندوؤں کو دے رکھی تھی۔ اور مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ اگر وہ اردو کی حمایت اور ناگری

(ہندی) کی مخالفت میں معمولی سا احتجاج کردیں تو کشتنی اور گردن زدنی قرار پائیں سیاسی تنظیم ملی کا ارادہ کریں، تو ان کا یہ اقدام اندیشہ ہائے دور دراز کا موجب بن جائے۔ کیا مسلمانوں کی بے بسی کا اور ہندو انگریز ساز باز کا یہ بدترین، اور عبرتناک ترین دور نہیں تھا۔

مسلمانوں کی ایک جداگانہ سیاسی انجمن قائم ہوگئی، اس کے کرتا دھرتا نواب وقار الملک تھے، لیکن محسن الملک ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شامل تھے، وہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت اور قومی تشخص کے داعی تھے، لیکن ان کے دل میں ہندوؤں کے خلاف ذرا بھی تلخی نہیں تھی، اپنے حقوق کے لیے جد وجہد کرنا دوسری بات ہے اور دوسروں کے خلاف بغض وعناد کے جذبے سے سرشار ہوجانا الگ چیز ہے، محسن الملک اگرچہ حقوق مسلمین کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور نیشنل کانگریس سے اس کے خطرناک رویے کے باعث، جو مسلمانوں کے حال اور مستقبل دونوں کے لیے مہلک تھا، اس کے خلاف تھے، اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روک رہے تھے، لیکن وہ ہندوؤں سے متنفر ہوگئے ہوں ایسا بالکل نہیں تھا۔

لکھنؤ میں بابو گنگا پرشاد ورما، ایک صلح کل سیاسی کارکن تھے، کانگریس کے نقیب بھی، انھوں نے دو اخبار نکالے تھے جن کی ادارت اپنے ہاتھ میں رکھی تھی، ایک "ہندوستانی" دوسرا "ایڈوکیٹ" یہ دونوں اخبار بھی سنجیدہ اور ثقہ قسم کے تھے، لکھنؤ کا مشہور "گنگا پرشاد میموریل ہال" جس میں قومی جلسے ہوتے رہتے ہیں، انہی کے اعتراف خدمات کے طور پر ان کے نام سے موسوم ہے، اس ہال میں گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، ڈاکٹر کچلو، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر انصاری، جواہر لال، موتی لال سب ہی وقتاً فوقتاً تقریریں کر چکے ہیں، غرض بابو گنگا پرشاد نے محسن الملک کے ایک

مضمون پر جو انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف لکھا تھا، اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ، گو نواب صاحب، مشترک پلیٹ فارم کے خلاف ہوں لیکن ہندوؤں کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ قابل تحسین حد تک اچھا رہا ہے، امر واقعہ بھی یہی تھا محسن الملک اپنے ساتھ جن آدمیوں کو حیدرآباد لے گئے تھے اور جنھیں اچھی نوکریاں دلائی تھیں ان میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، بالوگنگا پرشاد کے اس خیال نے محسن الملک کو "بیان صفائی" پیش کرنے کا موقعہ دیا، چنانچہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا اس میں لکھا :-

"ہمارے معزز دوست نے ہماری نسبت اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہم ہندو اور مسلمانوں کے دوستانہ روابط میں فرق پیدا کرنا نہیں چاہتے، حقیقت میں یہ سچ اور بالکل سچ ہے، انسان اپنا دل چیر کر نہیں دکھا سکتا اگر یہ ممکن ہوتا تو ہم دکھا دیتے کہ ہمارے دل میں یہ شوق اور یہ تمنا کہ ہندو مسلم ارتباط قائم رہے کس قدر ہے، اور ہم ہندوستان کی ترقی اور بہبودی کے لیے اسے کہاں تک ضروری سمجھتے ہیں اور جیسا کہ ہمارے معزز دوست نے لکھا ہے خود میرا برتاؤ اپنے ہم وطن بھائیوں کے ساتھ اس کا شاہد ہے۔

اگر ہم بعض پولٹیکل مسائل میں اپنے ہم وطن بھائیوں سے متفق نہیں ہیں، اس سے کسی کا یہ سمجھنا کہ ہم باہمی اتحاد و ارتباط کے مخالف ہیں صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے حالات و خیالات سے خوب واقف ہیں اور جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے ہم اپنی قوم کی پست حالت

پر ہمیشہ غم گین رہتے ہیں اور ان میں مثل دیگر قوموں کے علم، دولت اور عزت کی ترقی چاہتے ہیں اور ان افعال و اعمال سے ان کو بچانے کی فکر کرتے ہیں، جن سے ان کو نقصان اور ضرر پہنچنے کا احتمال ہے، بلاشک ہماری رائے ہے اور ہم اس پر اب تک بہت استقلال و استحکام سے قائم ہیں کہ نیشنل کانگریس مسلمانوں کے لیے غیر مفید ہے، ہماری یہ رائے صحیح ہے یا غلط جس کو اس سے اختلاف ہو وہ ہماری رائے کی نسبت جو چاہے کہے، مگر ہم کو محض اختلاف رائے کی وجہ اور بنا پر اپنا مخالف نہیں کہہ سکتا، اختلاف رائے اور چیز ہے مخالفت اور شے ہے!"

محسن الملک کا یہ بیان صفائی کس درجہ مدلل، معقول اور مبنی بر حقائق ہے۔ اس میں کسی طرح کی تلخی نہیں، کسی طرح کا عناد نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے دل کھول کر سامنے رکھ دیا ہے، سارا بیان پڑھ جائیے، فکری اختلاف کے باوجود کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کرتے تھے یا کسی طرح کا تعصب روا رکھتے تھے۔

حیرت اس پر ہے کہ بعض "نیشنلسٹ" اہل قلم نے سرسید، محسن الملک، وقار الملک اور علی گڑھ کے سیاسی مسلک پر جب قلم اٹھایا تو بڑی بے دردی سے ان کے ان اقدامات کو سرکاری اشارے پر مبنی قرار دیا، علی گڑھ محمڈن کالج کے پرنسپل مسٹر بیک، مسٹر ماریسن اور مسٹر آرچ بولڈ کو انگریزی سامراج کا نمائندہ قرار دیا، حالانکہ یہ لوگ دل سوزی کے ساتھ مسلمانوں کے اس ادارے کی خدمت کر رہے تھے، لیکن حیرت کا مقام یہ ہے کہ یہ اصحاب جو مسلم سیاست کو انگریزی طلسم سازی کا کرشمہ بیان کرتے ہیں، کانگریس کے بارے میں بالکل خاموش ہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کانگریس، اس کی تحریک

اس کی تنظیم اور اس کے افکار سیاسی تمام تر انگریزوں ہی کے اشارہ چشم و ابرو کا نتیجہ تھے، علی گڑھ یا سرسید اس لیے مطعون اور مقہور ہے کہ اس نے ان چند انگریزوں کے اثر و رسوخ اور فکر سے کسی حد تک فائدہ اٹھایا، جو ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ تھے، لیکن کانگریس پھر بھی سب سے بڑی حریت مآب تحریک شروع ہی سے مانی جا رہی تھی، جس کا جنرل سکریٹری ایک پنشن یافتہ انگریز، ربع صدی سے کچھ کم مدت تک مسلسل اپنے منصب پر قائم رہا، اور کانگریس کو اپنی انگلیوں پر نچاتا رہا، جس کی تعمیر و تشکیل میں ہندوستان کے سب سے بڑے انگریز اور برطانوی سامراج کے سب سے بڑے نمائندے لارڈ ڈفرن کا دماغ کام کر رہا تھا، اور جس کے سالانہ اجلاس کی صدارت ۱۸۸۹ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک پانچ، انگریزوں نے کی اور تقریباً یہ سب کے سب انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کے ریٹائرڈ ممبر تھے، امر واقعہ یہ ہے کہ کانگریس نے انگریزوں سے بہت زیادہ رہنمائی حاصل کی مسلمان اس باب میں اس سے بہت پیچھے ہیں - وہ تو حد درجہ نیازمندی کے باوجود معتوب رہے، اور یہ گرمئ سخن کا مظاہرہ کرنے کے باوجود لاڈلے بنے رہے۔

بہرحال مسلمانوں کی پہلی سیاسی انجمن جو محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کے نام سے موسوم تھی، ۱۹۰۱ء میں قائم ہوئی اور تقریباً ۱۹۰۴ء تک کسی نہ کسی طرح زندہ رہی، اگرچہ اس کی یہ زندگی حقیقی زندگی نہیں تھی، باقاعدہ تحریک اور تنظیم کا دور کچھ مدت کے بعد شروع ہوا، اس لیے کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور اگر اب بھی مسلمان خاموش رہتے تو انگریز ہندو ساز باز سے مسلمانوں کی حیثیت اچھوتوں سے بدتر ہو جاتی، مدت سے انھیں زندہ رکھنا منظور تھا اس لیے ہر طرح کی در اندازیوں اور مخالفتوں کے باوجود بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر انھوں نے دریائے بے پایاں میں قدم رکھ دیا!

سیاستِ ملّی کا عہد آفریں دور

اب ہم مسلم انڈیا کی تاریخ سیاست ملّی کے ایک نہایت اہم اور عہد آفریں دور میں داخل ہو رہے ہیں۔

مورخ کے لیے جو "ضابطۂ اخلاق" عہد جدید میں مرتب کیا گیا ہے، وہ حد درجہ دلچسپ اور ناممکن العمل ہے۔ مورخ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ صرف بیان واقعات پر اکتفا کرے۔ اپنی طرف سے رنگ آمیزی نہ کرے، اپنی رائے کا اظہار نہ کرے، اس کی غیر جانبداری شک و شبے سے بالا ہو، اس مطالبے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مورخ کو بے حس پتھر کی مورتی سمجھ لیا گیا ہے، جو واقعات و حقائق سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ ناممکن العمل اس لیے ہے کہ آج تک ان صفات و اوصاف کا کوئی مورخ نہ پیدا ہوا ہے نہ قیامت تک پیدا ہو سکے گا۔ مورخ بھی ایک انسان ہوتا ہے، وہ آنکھوں سے دیکھتا بھی ہے، دماغ سے سوچتا بھی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ اپنے مشاہدات کو جھٹلا دے، اور اپنی فکر سے خود ہی جنگ و پیکار شروع کر دے؟ مستشرقین نے اسلام کی تاریخ کو جس طرح فسخ کیا ہے۔ کیمرج اور آکسفورڈ کے مانے ہوئے اور مسلم الثبوت دانشوروں نے، اسلام

کے اکابر کی جو غلط تصویر کھینچی ہے امریکہ اور کنیڈا میں گزشتہ کافی مدت سے مورخین
و محققین کی جو کھیپ تیار ہو رہی ہے اور جس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جاتا
ہے۔ کیا ان میں سے کسی ایک کی بھی مثال دی جا سکتی ہے کہ اس کی ساری کتاب
پڑھ جاؤ مگر کہیں سے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ خود لکھنے والے کے جذبات و تاثرات
اور افکار و آرا پیش کردہ واقعات کے سلسلے میں کیا ہیں؟ اس کے برعکس ہر صفحہ
راز درونِ پردہ، سوز نہاں اور قلب تپاں کی غمازی کرتا رہتا ہے؟ ہماری آج کی
دنیائے تاریخ فلپ کے حتی، ٹوئین بی اور اسی پائے کے دوسرے تاریخ نگاروں
پر فخر کرتی ہے، لیکن کیا ان بزرگوں نے اپنی لکھی ہوئی کتابوں میں حکمت، ہنر اور
ذہن رسائی کی مدد سے مسلمانوں کے بارے میں، ان کے مذہب کے بارے میں
ان کی تخلیقات کے بارے میں غلط، ناواجب اور سرتاسر غیر تحقیقی باتیں بھی نہیں
لکھ دی ہیں؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ لکھنے والا غیر جانبدار تماشائی رہ سکے۔ جب وہ
اپنی تحقیق پیش کرتا ہے تو اپنی تحقیق کے نتائج کیوں نہ پیش کرے گا؟ اور یہ بات
چنداں قابل اعتراض بھی نہیں تاریخ صرف بیان و واقعات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ
ایک رواں دواں، مسلسل اور متواتر سلسلہ ہے علت اور معلول کا، سبب اور مسبب
کا، عمل اور ردِ عمل کا، وہ مورخ کیا ہوا جو صرف واقعات آموختے کی طرح فرفر
سناتا چلا جائے اور علت و معلول، سبب اور مسبب، عمل اور ردعمل کا ذکر
نہ کرے، ایسی ناقص کہانیاں تو صرف عجائب خانے کی زینت بن سکتی ہیں۔ علم
ادب اور تاریخ کے بازار میں ان کی حیثیت اگر بصد مشکل کچھ تسلیم بھی کرائی جا
سکتی ہے تو صرف کھوٹے پیسے کی،!

مورخ کو اس کی پوری آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ واقعات کے ساتھ ساتھ
ان کے اسباب و علل اور محرکات و عوامل بھی پیش کرے، اور اس سلسلے میں اپنی

رائے بھی ظاہر کرے، البتہ مورخ سے جو مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور جو یقیناً کیا جانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ وہ واقعات کو مسخ نہ کرے۔ حقائق کو چھپائے نہیں، اور اسباب و علل کی بحث میں منطقی مغالطے سے کام نہ لے، اگر وہ اتنا کر سکے تو وہ یقیناً اپنے قارئین پر احسان کرے گا، اور اس کے قارئین اپنے دماغ سے کام لے کر خود کوئی رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

لیجیے یہ گفتگو ذرا طویل ہو گئی۔ لیکن اس لیے کرنی پڑی کہ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ میں، زیر بحث حصّہ ایک نئے دور کا آغاز ہے اور یہ ختم ہوتا ہے قیام پاکستان پر، یعنی اس کی عمر نصف صدی سے کچھ زیادہ پر محیط ہے، اس دور کی جو تاریخیں انگریزوں نے، ہندوؤں نے اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے لکھی ہیں، ان میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ واقعات کو زیادہ سے زیادہ مسخ کیا جائے۔ حقائق کو جہاں تک ممکن ہے چھپایا جائے، اسباب و علل اور محرکات و عوامل کا ذکر کرتے ہوئے جتنے مغالطے دیے جا سکتے ہیں دیئے جائیں۔ الّا ماشاء اللہ

یہ ظلم صرف تاریخ پر نہیں ہے۔ ایک قوم پر بھی ہے اور انسانیت پر بھی،!

کانگریس کا رویّہ

اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں! ــــ یعنی تقسیم بنگال، مسلم لیگ کا قیام، اور وفد شملہ!

لیکن یہ کہانی شروع کرنے سے پہلے ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر سہ موضوعات کے ہنگامہ آفریں آغاز کے سلسلے میں ہندوؤں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس کا کردار کیا رہا؟ وہ بھی پیش نظر رہے، اس کی روشنی میں زیادہ صحت اور وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کے اقدام و عمل کو پرکھا اور سمجھا جا سکے گا۔

سر ہنری کاٹن

۱۹۰۴ء ۔ اُس سال کانگریس کا سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد

ہوا۔ مندوبین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ صدر اجلاس سر ہنری کاٹن تھے۔
موصوف بڑے کمالات کے بزرگ تھے، ۱۸۶۰ء میں انڈین سول سروس
(آئی سی ایس) کا امتحان لندن سے پاس کیا، گیارہ سال تک مونا پور میں مجسٹریٹ
رہے۔ کلکٹر، بورڈ آف ریونیو کے ممبر، اور کلکتہ کارپوریشن کے صدر بھی رہے، حکومت
بنگال کے چیف سکریٹری، پھر ہوم ممبر رہے۔ آسام میں چیف کمشنری کے بلند
منصب پر بھی فائز رہے ۱۸۹۲ء میں سی ایس آئی کے خطاب سے مشرف ہوئے، پھر
نائٹ (سر) بنا دیئے گئے "NEW INDIA" کتاب کے آپ مصنف بھی ہیں،
پنشن کے بعد خود، یا اپنی سرکار (برطانیہ) کے ایما پہ کانگریس میں شریک ہو گئے
یہاں بھی صدارت کا منصب نہ جانے کب سے چشم براہ تھا، آئے اور مسند صدارت
پر متمکن ہو گئے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں بعض بڑے پتے کی باتیں فرما گئے، ارشاد ہوا:

"ہماری امیدیں بر آنے کو ہیں، بنیاد مستحکم ہے اور عمارت تیار ہو رہی
ہے۔ آپ نے ایک ایسی تحریک شروع کی ہے جو روز بروز بڑھتی ہی
جائے گی، ابھی سے یہ تحریک قوم کے مختلف شعبوں کی محرک بن گئی ہے
ان کی نشو و نما پر اور انھیں قابو میں رکھنے پر قادر ہو گئی ہے۔ ہندوستان
میں ایک قوم بننا بہت بڑا سیاسی انقلاب ہے، اور یہ سب کچھ ہمارے
سامنے ہو رہا ہے۔ کوشش جاری رکھو، کیونکہ ترقی کی لہریں موج زن
ہیں، اب اس لہر کو روکنا انسانی طاقت سے باہر ہے، اور اگر رکی
بھی تو عارضی طور پر رکے گی۔

غور کیجیے مسلمان کانگریس کے خلاف ہیں۔ اپنی ایک جداگانہ کمزور سی سیاسی
تنظیم قائم کر چکے ہیں۔ مگر انڈین نیشنل کانگریس کا صدر (جو کم از کم اس موقع پر نہ
انڈین تھی نہ نیشنل)۔ ہندوستان میں "ایک قوم" کا نعرہ زور و شور سے بلند کر رہا

ہے، اور صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ اس لہر کو روکنا کسی انسانی طاقت کے بس میں نہیں ہے، مطلب یہ کہ مسلمان چاہیں یا نہ چاہیں، کانگریس میں شریک ہوں یا نہ شریک ہوں، اپنی جداگانہ ملّی تنظیم بنائیں یا نہ بنائیں، انھیں ہندوستان کی قومیت متحدہ کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، انجام کار انھیں اکثریت کی حکومت تسلیم کرنا پڑے گی، اور اسی کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا پڑے گی۔

اپنے خطبۂ صدارت میں سر ہنری کاٹن نے، اور "ایک متحدہ مرکزی" حکومت کا نظریہ بھی پیش کیا، جو اس بات کی پیش بندی تھی کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں رہتے ہیں وہاں بھی ملک کی مجموعی اکثریت انھیں تابع فرمان رکھے گی۔

بنگال کی تقسیم یہ گویا مسلمانوں کے لیے ایک اور چیلنج تھا۔

اس اجلاس میں جو تجویزیں منظور ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور معنی خیز تجویز بنگال کے بارے میں تھی۔

لارڈ کرزن نے اپنی اسکیم شائع کردی تھی کہ بنگال کو دو حصّوں میں تقسیم کردیا جائے، ایک مغربی بنگال اور دوسرا، مشرقی بنگال، پورے بنگال میں مجموعی طور پر ابھی مسلمانوں کی اکثریت (مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق) نہیں ہوئی تھی ۱۹، ۲۰ کے فرق سے ہندو ہی اکثریت میں تھے، لیکن لارڈ کرزن کی اس تجویز کی رو سے مشرقی بنگال مسلمانوں کی اکثریت کا ایک صوبہ قائم ہوجاتا تھا، لارڈ کرزن کی یہ اسکیم، مسلمانوں کی ہمدردی پر مبنی نہیں تھی، انھوں نے اور ان کے پیش رو گورنر جنرل صاحبان نے مغربی بنگال کے مسلم اوقاف، معافیات، اراضیات اور بہت سی چیزیں مسلمانوں سے چھین چھین کر، ہندوؤں کے جیب و دامن میں ڈال دی تھیں۔ اب انھوں نے مفلوک الحال اور فاقہ مست مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ایک صوبہ محض اشک شوئی اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے

قائم کیا تھا، کیونکہ مسلم اکثریت کے اس صوبے کی اقتصادی زندگی بہرحال ہندو سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر تھی۔

لیکن وہ ہندو قوم جو سارے ہندوستان میں تقریباً تین چوتھائی اکثریت رکھتی تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت کا یہ صوبہ اس اندیشے سے گوارا نہ کرسکی کہ آج مسلمان پسماندہ اور مفلوک الحال سہی، لیکن ایک وقت ایسا آسکتا ہے جب ان میں شعور سیاسی پیدا ہوگا۔ کیا اس وقت یہ ایک خطرہ نہیں بن جائیں گے؟ چنانچہ ہندوستان میں "ایک قوم" بنانے والی اور مغربی جمہوریت کے اصول پر نیا بنتی طرز حکومت کا مطالبہ کرنے والی عظیم ہندو قوم کی عظیم سیاسی تنظیم نے، نہایت تلخ، ترش اور تند الفاظ میں اس اسکیم کی مخالفت کی اور فضائے آسمانی میں اس کی دھجیاں اڑا دینے کا بہ صمیم قلب اعلان کردیا۔ اب آگے چلیے۔

۱۹۰۵ء۔ اس سال کانگریس کا سالانہ اجلاس، ہندوؤں کے سب سے زیادہ مقدس مقام بنارس میں منعقد ہوا، صدارت کے فرائض مسٹر گوپال کرشنا گوکھلے نے انجام دیئے۔

گوکھلے نسبتہً اعتدال پسند تھے، شور وشر اور ہنگامہ آرائی کے قائل نہیں تھے پھر ایسے انقلابی موقع پر انھیں صدر کیوں بنایا گیا؟ اس لیے کہ حکمراں قوم پر واضح کردیا جائے کہ گوکھلے جیسے معتدلین بھی، لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے فیصلے سے خوش نہیں ہیں اور وہ بھی اس تقسیم کی تنسیخ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔

یہ اجلاس ایسے موقعے پر ہوا کہ بنگال تقسیم ہوچکا تھا، یعنی مسلم اکثریت کا صوبہ، ۔ جس میں آسام بھی شامل تھا۔ عالم وجود میں آچکا تھا۔ اس فیصلے کے نافذ ہونے کے بعد، سارے ہندوستان میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً آگ لگ گئی، ہنگامے شروع ہوگئے۔ بنگال کے ہندوؤں نے بنگال کے مسلمانوں پر

اپنی اکثریت اور بالادستی قائم رکھنے کے لیے، ہنگامۂ قیامت برپا کر دیا۔ وہ دہشت پسند بن کر نمودار ہوئے وہ انارکسٹ کی حیثیت سے ابھرے، وہ امن شکن، باغی اور انقلابی بن گئے۔ کسی قیمت پر بھی وہ بنگال کے مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

لارڈ کرزن بھی، لارڈ کرزن ہی تھے، انھوں نے اس شورش کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ وہ عزم محکم کے مالک تھے، ایک مرتبہ فیصلہ کر لینے کے بعد اسے واپس نہیں لیتے تھے، انھوں نے ہندوستان کو فائدے بھی بہت پہنچائے تھے وہی تھے جنھوں نے محکمۂ آثار قدیمہ قائم کر کے، ان بیش بہا ہندو مسلم یادگاروں کو مٹنے اور برباد ہونے سے بچا لیا۔ جو دست برد زمانہ سے اور ہندوستانیوں کی جہالت کے باعث تیزی سے برباد ہوتی جا رہی تھیں، بلکہ کافی حصہ برباد ہو بھی چکا تھا، لیکن ان کی یہ بھلائیاں فراموش کر دی گئیں۔ انھیں مسلم دوستی کا طعنہ دیا گیا، بہ فرض محال یہ واقعہ ہوتا تو بھی اسے تو نہ بھولنا چاہیے تاکہ ان سے پہلے کے جتنے گورنر جنرل تھے، سب "بہ خال ہندوش" سمرقند و بخارا بخشتے چلے آ رہے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ بعد میں جب بنگال سے بہار کو الگ کیا گیا اور اڑیسہ کو منقطع کیا گیا تو نہ کانگریس نے احتجاج کیا، نہ انارکسٹ اور دہشت پسند میدان میں آئے، نہ شورش برپا ہوئی، نہ ہنگامہ آرائی ہوئی اس لیے کہ بہار بنگال سے الگ ہونے کے بعد بھی ہندو اکثریت کا صوبہ تھا اور اڑیسہ میں بنگال کے دائرے سے نکل جانے کے بعد بھی ہندو اکثریت تھی، ہندو اکثریت اگر محفوظ تھی تو پھر قطع اور برید پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

بہرحال بنگال کی تقسیم نے، سب سے زیادہ جس سیاسی جماعت کو برافروختہ کیا۔ وہ نیشنل کانگریس تھی۔

اسی زمانے میں کانگریس نے اسی تکنیک کا استعمال کیا جس میں فن کارانہ مہارت کا گاندھی جی کے زمانے تک وہ برابر ثبوت دیتی چلی آئی تھی۔ یعنی وہ دو گروہوں میں بظاہر بٹ گئی۔

اس زمانے میں پرنس آف ویلز وارد ہندوستان ہو رہے تھے۔ تلک اور لاجپت رائے نے کانگریس سے یہ تجویز منظور کرانا چاہی کہ پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ کیا جائے۔

اگر یہ تجویز منظور ہو جاتی تو کانگریس کا بھرم کھل جاتا اور انگریزوں کی سرپرستی سے۔ جس کی ابھی اسے ضرورت تھی — محروم ہو جانے کا اندیشہ تھا، لہٰذا کانگریس کے دوسرے گروہ نے تلک اور لاجپت رائے کی تجویز مسترد کرادی۔ اس کے بجائے شایان شان ..... استقبال کی تجویز گوکھلے اور سریندر ناتھ بنرجی نے منظور کرائی۔

اس تماشے کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو کو باور کرایا جائے کہ دیکھو تقسیم بنگال نے، ہمارے انتہا پسند طبقے کو کس درجہ مشتعل کر دیا ہے۔ لیکن ہم تم سے مایوس نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم نے اسے دبایا۔ اور استقبال کی تجویز منظور کرادی۔ پس بہتر یہ ہے کہ ہمارے اس اخلاص کی قدر کرو، اور تقسیم کا فیصلہ واپس لے لو،

تقسیم بنگال سے مشتعل ہو کر، ایک ہمہ گیر تحریک بدیشی مال کے بائیکاٹ کی، اور سودیشی مال کے رواج کی بھی شروع ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں مولانا حسرت موہانی نے بھی علی گڑھ میں "اردوئے معلی" کی ادارت کے ساتھ ساتھ ایک کھدر بھنڈار بھی کھول لیا تھا۔

کیا طرفہ تماشا تھی حسرت کی طبیعت بھی!

بائیکاٹ کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انگریز محسوس کریں کہ اگر تقسیم بنگال کا فیصلہ قائم رہا تو ان کے مال کا سب سے بڑا گاہک (ہندو قوم) ان کے ہاتھ سے

نکل جائے گا۔ اور وہ شدید مالی بحران میں مبتلا ہو جائیں گے۔

بائیکاٹ کی تجویز کانگریس میں باقاعدہ پیش ہوئی۔ صدر کانگریس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر، اس تجویز پر رائے شماری نہیں ہونے دی، البتہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بحث و گفتگو کی اجازت دے دی۔ گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ:۔

"قانون کے حدود میں رہ کر، اگر تحریک چلائی جائے تو یہ حکمراں قوم کے خلاف اچھا اور پر امن ہتھیار رہے"

فراست اور ذہانت دیکھیے، تجویز پہ رائے شماری نہیں ہوئی، لہٰذا اس کے منظور یا نامنظور ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ البتہ گفتگو ہوئی، اور اس انداز میں ہوئی کہ اس سے آگے چل کر بہت سے کام لیے جا سکتے تھے!

اور اس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ صدر کانگریس کو مجاز قرار دیا گیا کہ وہ لندن تشریف لے جائیں۔ اور وہاں کے وزراء، ممبران پارلیمنٹ، اور اصحاب سیاست و صحافت کو کانگریس کا نقطۂ نظر سمجھائیں۔ پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ کرنے کی تجویز منظور کرا کے، شایان شان استقبال کرنے کا فیصلہ کانگریس سے کرا کے انھوں نے اپنے ہاتھ مضبوط کر لیے تھے۔ اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تجویز پر رائے شماری نہ کرا کے اپنے آپ کو اور زیادہ مسلح کر لیا تھا۔ اب وہ کامل اطمینان اور ایقان کے ساتھ لندن جانے کا حق رکھتے تھے۔

بسلامت روی و باز آئی!

اور آگے چلیے،

۱۹۰۶ء ۔ تقسیم بنگال کے فیصلے کے بعد اس اجلاس کو لازمی طور پر کلکتے ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ جو صوبہ بنگال کا صدر مقام، اور حکومت ہند کا دارالحکومت بھی تھا۔

اس اجلاس کے صدر دادا بھائی نوروز جی تھے۔ اس سال مندوبین کی تعداد گزشتہ سال کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ گزشتہ سال ایک ہزار دس مندوب آئے تھے۔ اس سال ۱۶۶۳ تک ان کی تعداد پہنچ گئی۔

اس اجلاس کی تصویر کشی کرتے ہوئے ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ فرماتے ہیں :-

"کانگریس کا ماحول (تقسیم بنگال کے باعث) بائیکاٹ کے جوش اور جذبے سے معمور تھا، بابو بپن چندر پال سب سے آگے آگے تھے وہ بائیکاٹ کے بہت بڑے مبلغ اور داعی کی حیثیت سے گل افشانیاں کر رہے تھے۔ پنڈت مالویہ، تلک، لاجپت رائے، سب یہی بولیاں بول رہے تھے!"

دادا بھائی نے بڑا معنی خیز خطبۂ صدارت دیا، انھوں نے فرمایا :-

"کوئی تحریک ہو بڑی یا چھوٹی استقلال ضروری ہے مایوسی ہو یا ناکامی قدم آگے ہی بڑھاتے جاؤ۔ ورنہ اور بھی پس پائی اختیار کرنا پڑے گی، اور آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گا آگے بڑھو، راستہ خود بخود ملتا جائے گا، بس استقلال شرط ہے، ہمارا نصب العین صحیح ہونا چاہیے۔ پھر آخری فتح ہماری ہوگی!"

صدر دادا بھائی ابھی ابھی لندن سے آئے تھے، یا بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں، اس مرتبہ ایک نئی اصطلاح مطالبے کی صورت میں استعمال کی، یعنی سوراجیہ، یہ ایک نئی اصطلاح ابھی مبہم تھی۔ زیادہ صاف اور واضح نہیں تھی۔ لیکن اتنی غیر واضح بھی نہ تھی کہ اہل نظر اور اصحاب فکر اس کے مضمرات نہ سمجھ پاتے۔ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالنے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی کہ اقلیتی فرقے کا ایک فرد، سوراج کا مطالبہ کرے، جس سے اکثریت تو اب تک گریز کرتی چلی آئی تھی، گوکھلے کا مشن کامیاب نہ ہو سکا تھا،

لہٰذا دادا بھائی کو آگے بڑھایا گیا تھا۔ دادا بھائی نے تقسیم بنگال پر سخت عتاب اور برہمی کا اظہار فرمایا۔

بائیکاٹ کی تحریک بالکل جائز اور درست ہے!

اب تک کانگریس، سرکار برطانیہ کی یار و فادار تھی۔ اس کے مندوبین کو صوبوں کے گورنر دعوت پر بلاتے تھے اور گورنر صاحبان خود بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ تشریف لاتے تھے، پیٹھ تھپکتے تھے اور حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرماتے تھے۔

لیکن اب وہ معتوب ہو چکے تھے۔ بنگال کی تقسیم ایسا گھاؤ تھا جسے ہندو سامراج کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہر قیمت پر اس فیصلے کو منسوخ کرانے پر وہ تلا ہوا تھا۔ سارا بنگال شورش پسندوں سے بھرا ہوا تھا اور حکومت پر مسلسل حملے ہو رہے تھے۔

یہ تماشہ دیکھ کر انگریز چونکے ہوئے، لیکن، اب ان کے اختیار میں کچھ نہ تھا، انھوں نے دودھ پلا کر سانپ پالا تھا، اور اب وہ انھیں ڈسنے پر تلا ہوا تھا، وہ اس قوت کے سامنے جھکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فوری طور پر تو نہیں لیکن رفتہ رفتہ ان کے قدم پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کو خفا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی پالیسی کے خلاف بھی تھا۔ اور اصول کے بھی۔ وہ جس نظام حکومت کے خوگر تھے۔ اس میں اکثریت ہی سب کچھ تھی، اور اکثریت کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے وہ ہچکچاتے تھے،

مسلمان نہ بم پھینک سکتے تھے نہ توڑ پھوڑ کی پالیسی پر عمل کر سکتے تھے۔ نہ قاتلانہ حملے کر سکتے تھے۔ نہ دہشت پسندوں کا ثبوت دے سکتے تھے۔ وہ تقسیم بنگال سے خوش تھے، اس تقسیم میں انھیں اپنے مقدر کا ستارہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت میں "جعفر و صادق" ہمیشہ سے لکھے ہوئے ہیں جس طرح پاکستان کی

تحریک سے بعض مسلمانوں نے اختلاف کیا تھا۔ اس طرح، چند مسلمان بنگال میں بھی ایسے تھے جو ہندو اکثریت کی تائید کر رہے تھے مثلاً نواب زادہ عتیق اللہ خان، اور نواب امیر حسن خاں، لیکن راز اب تک راز ہے۔ اور شاید ہمیشہ راز ہی رہے گا کہ ان حضرات کی بنائے مخالفت کیا تھی؟ متحدہ بنگال میں، کون سی نعمت انھیں حاصل تھی جو منقسم بنگال میں ان سے چھن گئی تھی۔ حالانکہ امر واقعہ یہ تھا کہ متحدہ بنگال ان کی امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور قومی حسرتوں کا مرقع تھا۔ یہاں ذلت، پسماندگی جہالت اور بے وقری کے سوا انھیں کچھ حاصل نہ تھا۔ ملازمت کے دروازے ان پہ بند تھے۔ تجارت سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ زمینیں چھن چکی تھیں۔ حتیٰ کہ لاکھوں روپے کی آمدنی رکھنے والے اوقاف تک پہ غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا تھا۔ اور ان کی آمدنی ہندوؤں پر صرف ہو رہی تھی۔ کیا یہ محرومیاں اور خواریاں نواب زادے صاحب کو اور نواب صاحب کو اس درجہ پسند تھیں کہ ان سے دست بردار ہونے کو وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔؟

قدم اور آگے بڑھائیے،

۱۹۰۷ء — اس سال کانگریس کا اجلاس سورت میں ہوا، صدر اجلاس ڈاکٹر راش بہاری گھوش تھے۔ یہ اجلاس شور و شر، اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہو گیا۔ اس لیے کہ انتہا پسند اس اجلاس کو حکومت برطانیہ کے خلاف میدان جنگ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور نسبتاً معتدلین فی الحال اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے، انتہا پسندوں کے زعیم اکبر مسٹر تلک تھے۔ جو اپنی مسلم دشمنی کے اعتبار سے ناقابل فراموش شخصیت بن چکے ہیں، دوسرے بزرگ بپن چندر پال تھے جو سراسر شعلہ و شرر تھے۔ ان کی خطابت جادو کا کام کرتی تھی اور سننے والے مدہوش ہو جاتے تھے۔ اور تیسرے بڑے کی حیثیت سے لالہ لاجپت رائے پیش پیش تھے۔ وہ بھی مسلم دشمنی میں کسی طرح

تلک سے کم نہیں تھے۔

صاحب صدر نے اپنے فصیح و بلیغ خطبۂ صدارت میں، سارا زور تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے میں صرف کیا تھا، اس خطبے میں دھمکی بھی تھی اور خوشامد بھی —— جس سے کام چل جائے۔ موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا:۔

"غیر ملکی حکومت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو، لیکن اگر قوم میں خودی اور خودداری کا جوہر موجود رہے تو وہ کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ طوق غلامی لاکھوں پھولوں سے سجا ہوا ہو پھر بھی وہ طوق غلامی ہی ہے، انگریزی حکومت کے تاج میں ہندوستان ایک چمکتا ہوا ہیرا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا ملک ولائتی اشیا کے لیے بازار بن جائے اور غیر ملکی سرمایہ دار یہاں سے دولت لوٹ کر لے جائیں، ہم ملازمت کے لیے چکر کاٹتے رہیں، اور ساری اچھی اچھی اور اونچی اونچی ملازمتیں انگریزوں کو مل جائیں، ہم سے کتنی ہی میٹھی باتیں کی جائیں لیکن ہم ہندوستانی بھی برک "BURKE" اور مل، "MILL" کے خیالات سے متاثر ہو چکے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ایک قوم بننے کے لیے کیسی کیسی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، ہمارا راستہ طویل اور دشوار گزار ہے۔ لیکن ہم اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ کسی کو اپنے راستے میں سنگ گراں کی طرح حائل دیکھیں!"

یہ آتشیں الفاظ خود اپنی تشریح کر رہے ہیں۔

- —— ایک قوم کی تشکیل
- —— آزاد ہونے کا جذبہ
- —— بدیشی مال کا بائیکاٹ

• — اعلیٰ سرکاری عہدوں سے انگریزوں کا اخراج
• — تقسیم بنگال کی تنسیخ
• — ہر قیمت پر، اور ہر حالت میں ہندو اکثریت کی بالادستی، اور اقتدار کا استحکام

یہ تھا اس خطبۂ صدارت کا لب لباب۔

یہ ساری شورش درحقیقت مسلمانوں ہی کے خلاف تو تھی۔

مسلمان اپنی قومی انفرادیت قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن ہندو اکثریت انگریزوں کے تعاون سے قومیت متحدہ کے سمندر میں انھیں غرق کر دینا چاہتی تھی۔

مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اور بلدیات میں اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں اپنے نمائندے وہ خود منتخب کریں۔ لیکن ہندو اکثریت اس دوئی کو اپنے مفاد اور مصالح کے خلاف سمجھتی تھی۔ اور وہ یہ حق دینے کو ہرگز تیار نہیں تھی، انگریز بھی ان کے ساتھ تھے۔

مشرقی بنگال کو جداگانہ صوبہ قائم رکھنے پر مسلمان سختی کے ساتھ قائم تھے، لیکن ہندو اکثریت اپنے تمام حربوں سے مسلح ہو کر اور تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر، میدان میں نکل آئی تھی کہ یہ فیصلہ قائم نہیں رہ سکتا، تقسیم کا فیصلہ منسوخ کرنا ہی پڑے گا۔ شروع شروع میں تو حکومت برطانیہ کی طرف سے شد و مد کے ساتھ اعلان کیا جاتا رہا کہ یہ "طے شدہ مسئلہ ہے اور اب اسے بدلا نہیں جا سکتا!" لیکن جیسے جیسے دہشت پسند بڑھتے گئے، اور ہنگامہ آرائی میں ترقی ہونے لگی۔ انگریزوں نے "باعزت واپسی" کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ان کا معمول رہا ہے مسلمان ایک بے بس تماشائی کی طرح یہ جگر فگار منظر دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ ۔

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے　　آشیاں لٹتا رہا۔ ہم ناتواں دیکھا کیے

بے شک ان کے دل میں تلاطم مچا ہوا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ میدان عمل میں اتر آنا چاہتے تھے۔ لیکن اب تک ایسا کر نہیں سکے تھے۔ اگرچہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اب کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی مخلصانہ کوشش

اور بہ ایں ہمہ، ان تمام فتنہ طرازیوں کو وہ صرف اختلاف رائے تک محدود رکھے ہوئے تھے۔ اب تک انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا، نہ اس سے بے آس ہوئے تھے فروری ۱۹۱۰ء میں مسٹر گوکھلے علی گڑھ تشریف لائے اور انھوں نے کالج میں ایک تقریر ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر کی۔ تو نواب محسن الملک نے جو کالج کے سکریٹری تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کی مدح و ثنا میں زورِ حکایت صرف کر دیا۔

اس کے بعد لکھنؤ میں ایک دعوت کے موقع پر محسن الملک نے گوکھلے کے جام صحت کی تائید کی۔ ان کے خدمات کا اعتراف کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے قیام و استحکام کو ملک کی سلامتی کے لیے ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی ساتھ شریفانہ لب و لہجے میں اور دبے دبے الفاظ میں موجودہ صورتِ حال پر روشنی بھی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا اور کتنے پتے کی بات کہی:۔

"جب سے مغربی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے۔ روز بروز اختلافات بلکہ مخالفت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ دوستی کی جگہ باہمی نفرت بڑھ رہی ہے۔ اتحاد کی خوبی اور ضرورت پر بڑے بڑے لیکچر دیے جاتے ہیں، بہت پرجوش تقریریں کی جاتی ہیں مگر اختلاف دور کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کی تدبیر نہیں کی جاتی، اگر اتحاد کا وعظ کہنے والے یہ چاہیں کہ ہم اپنی زبان (اردو) کو قائم رکھنے کے لیے بھی ان کے حملوں کا دفاع نہ کریں۔ اور اگر

ایسا کریں تو ہم اتحاد کے دشمن اور مخالفت پیدا کرنے والے سمجھے جائیں تو اس میں قصور ہمارا ہے یا ہمارے دوستوں کا ؟ ایسا اتحاد تو وہی شخص چاہے گا کہ جو اپنی قومیت کی مخصوص علامت کو ترک کرنے کی پروا نہ کرے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اپنی قوم کو دوسری قوم میں جذب ہو جانے کو اتحاد سمجھے۔ ہم اس کو اتحاد نہیں سمجھتے! جو لوگ سمجھاتے ہیں وہ دوسری قوم کو نہ کہ اپنی قوم کو، حالانکہ سمجھانا چاہیئے اپنی قوم کو تاکہ نصیحت کا اثر ہو۔ مسلمان لیڈروں کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کو ان باتوں کے کرنے سے روکیں جن میں ان کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو، اور جن کے کرنے سے ان کے ہم وطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو، اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں۔ مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو مسلمانوں کو ہدایت و نصیحت کریں۔ اور صرف اپنے اپنے فائدوں ہی کا خیال رکھیں۔ اس کا نمونہ ہمارے ہز میجسٹی امیر کابل نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور ہندوؤں کی دل شکنی کے خیال سے گائے کی قربانی نہ کرنے کی (مسلمانوں کو) ہدایت کی ہے!"

اسی طرح سرسید کی برسی کے موقعے پر اپریل ۱۹۰۶ء میں جب تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہندو جارحانہ پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے ایک تقریر کرتے ہوئے نواب صاحب نے کہا:-

"ہندو بھائیوں سے سچی دوستی اور خالص دوستانہ برتاؤ (کالج میں) رکھو، جو (ہندو مسلم) اختلاف کو اچھا سمجھتا ہو اور اس پر عمل کرتا ہو، اسے ملک کا اور اپنی قوم کا دشمن سمجھو۔ جب سے انگریزی تعلیم نے ترقی کی ہے، تب سے دوستی گھٹتی اور دشمنی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا علم یکے کہ

ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متنفر ہونے لگے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو افسوس ہے ایسی تعلیم پر، اور حیف ہے اس تہذیب پر، اس سے تو جہل ہزار درجے بہتر ہے۔

میرے عزیزو، تم ہرگز سرسید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے، نہ تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے مستحق ہو گے۔ اگر تم نے ہندو مسلمانوں میں کچھ فرق سمجھا۔ اگر ایسا کرو گے تو نہ صرف تم بدنام ہو گے بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہو گا۔ میرے عزیز بچّو، ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو۔ ان کے بزرگوں کو ادب اور عزت سے یاد کرو، ان کے ساتھ محبت اور اخلاص سے پیش آؤ اگر کوئی بات اختلاف کی انہی کی طرف سے پیدا ہو تو اس کے جواب میں ایسا برتاؤ کرو کہ وہ تمہارا تحمل اور دوستی دیکھ کر تمہاری قدر کریں، اور اپنے طرزِ عمل کو بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ انصاف نہیں کہ اپنے آپ کو معصوم سمجھو۔ اور اختلاف کا الزام ہندوؤں کو دو۔ تم اس کالج کے نیک نام طالب علم اور سرسید کے سچے مقلّد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت سمجھے جاؤ گے جب تم اپنے ہم وطن بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کرو، اور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو۔ ہم ہندو اور مسلمانوں پر دوسری مصیبتیں اور آفتیں، افلاس ادبار، جہالت، تنگئ رزق کی کیا کم ہیں جو باہمی تفرقے کی بڑی مصیبت کو ہم لوگ اپنے اوپر لیتے ہیں۔ اور اس بلائے ناگہانی کے لیے اپنے دروازے کھول لیتے ہیں۔ اے خدا تو ہندو مسلمانوں پر رحم کر اور توفیق دے کہ عناد کی آگ کو بجھائیں، نہ کہ اس کو تیز کریں!"

ہندو مسلم اتحاد پر دل میں اُتر جانے والی اتنی اثر انگیز تقریر بہ تحریکِ خلافت

و کانگریس کے عہدِ عروج میں بھی گاندھی جی تک نے نہ کی ہوگی!

سودیشی مال کی تحریک بنگال کے ہندوؤں نے تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کے لیے ایک حربے کے طور پر شروع کی تھی، لیکن چونکہ یہ مفید تحریک تھی۔ اس لیے محسن الملک نے اس کی تائید و حمایت سے گریز نہیں کیا۔ اور ذرا پرواہ نہیں کی کہ اس سے انگریز کیا اثر لیں گے؟

اکتوبر ۱۹۰۵ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں نواب صاحب نے ایک مقالہ تحریر فرمایا جس میں ارشاد کیا:۔

"یہ بزازوں کی دکانیں، یہ خوب صورت چینی کے برتنوں کے ڈھیر یہ بساط خانے وغیرہ۔ مٹی کے ڈھیر ہیں جو ہمارے سونے چاندی کے عوض یورپین کارخانوں سے چلے آتے ہیں۔ یہ ایشیائی دوکاندار جو یورپین اشیاء فروخت کرتے ہیں، بظاہر سوداگر معلوم ہوتے ہیں، مگر درحقیقت یورپ کے خیرخواہ اور نمک حلال کارندے ہیں۔ اپنے وطن اور ہم وطنوں کا خون جگر پیتے ہیں۔ تمھارے ہم وطن دکانوں پر دامِ تزویر بچھائے تمھیں لوٹنے کو بیٹھے ہیں۔ جیسے مکڑی اپنے جالے میں مکھی کو پھانس لیتی ہے۔ اگر اس تحریک سے ہم فائدہ اٹھائیں تو یہ بڑی دانش مندی کی بات ہوگی۔ امریکہ اور جاپان نے اسی کی بدولت افلاس سے نجات پائی، مسلمان جو عرصے سے قوانین تمدن سے غافل رہ کر نقصانات اٹھا چکے ہیں، انھیں اب تیاری کرنی لازمی ہے۔"

لیکن اس خیرسگالی کا، اس اشتراک و تعاون کا، اس جذبۂ اتحاد کا نتیجہ کیا نکلا؟

ہندوؤں کی جارحانہ تحریک اور زیادہ شدید ہوگئی۔

انگریز گھٹنے ٹیکتے نظر آنے لگے۔

مسلمان کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن یہ صورت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی۔ آخر مسلمان جاگے، اٹھے اور کمر کس کر میدان میں آ گئے۔۔۔۔!

مسلم لیگ کا قیام
اور
اس کا پس منظر

۱۹۰۶ء کا سال مسلمانوں کے لیے عہد آفریں سال ہے۔ اور ہندو سیاست کے لیے بھی یہ ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے اثرات و نتائج نظر انداز نہیں کیے جا سکتے

پہلے دن سے کانگریس کی کوشش یہ رہی تھی کہ مبہم اور ذو معنی الفاظ میں۔ اس احتیاط کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلمان بھڑک نہ اٹھیں ۔۔۔ انگریزوں سے مغربی جمہوریت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ اکثریت کو فرماں روائی کے اور اقلیت کو چاکری کے حقوق حاصل ہو جائیں۔

مسلمان اگرچہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے اپنا دامن آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ ان کی قسمت کا فیصلہ وہ خود نہ کریں۔ دوسرے کریں۔ اگرچہ ہندو مسلم اتحاد کے وہ قول اور عمل دونوں سے سائل اور تمنائی تھے۔

ہندوستان میں سیاسی اصلاحات

مختلف وقفوں میں ہندوستان کو سیاسی اصلاحات کی دو قسطیں عطا ہو چکی تھیں اور تیسری اب عطا ہونے والی تھی۔

پہلی قسط ۱۸۵۸ء میں مرحمت ہوئی تھی یعنی گورنر جنرل کی کونسل کا قیام۔

عمل میں آیا تھا۔ اس کونسل میں کوئی غیر سرکاری ممبر نہیں تھا، سب انگریز تھے، اور نامزد تھے۔ ۱۸۶۱ء وہ سال ہے کہ اس کونسل میں تھوڑی سی توسیع ہوئی یعنی نامزدگی کے ذریعے تین ہندوستانی ممبروں کا تقرر عمل میں آیا۔ جن میں سر ڈنکر راؤ تھے۔ جو ریاست گوالیار کے وزیر خوش تقدیر تھے۔

۱۸۹۲ء میں اصلاحاتِ سیاسی کی دوسری قسط ملی، اس کے نتیجے کے طور پر میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نیز یونی ورسٹیوں اور ایوان ہائے تجارت کی طرف سے صوبائی کونسلوں میں ممبروں کو سوالات کرنے اور بجٹ پر بحث و گفتگو کرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی ضمنی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نہ کسی غیر سرکاری ممبر کی طرف سے کوئی تجویز پیش ہو سکتی تھی۔

۱۹۰۶ء میں رائٹ آنریبل جان مارلے (MARLEY) نے برطانوی دارالعوام میں جو بجٹ تقریر فرمائی اس میں اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ اصلاحاتِ سیاسی کی تیسری قسط سے ہندوستان کو بہرہ ور کر دیا جائے۔ اس قسط کی رو سے صوبائی کونسلوں میں توسیع کی جانی تھی ممبروں کے حقوق میں بھی اضافہ مدِ نظر تھا۔ لیکن صرف کسی حد تک۔ علاوہ ازیں ممبران کونسل کی تعداد کے ساتھ ساتھ رائے دہندگان (ووٹرس) کی تعداد اور انتخابی حلقوں کی تعداد میں بھی اضافہ متصور تھا۔

مسلمان ان سیاسی تبدیلیوں کو نہایت خوش اطواری اور سعادت مندی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، اب تک انھوں نے حدادب سے قدم آگے نہیں بڑھایا تھا، اب تک وہ جادۂ وفا سے منحرف نہیں ہوئے تھے۔ اب تک ان کے معروضات نے مطالبے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ صرف التجا اور استدعا کے قلعے میں محصور تھے۔ بے شک وہ کانگریس میں عامۃ المسلمین کی شرکت پسند نہیں کرتے تھے، لیکن کانگریس کو یا ہندوؤں کو مسلمانوں کا دشمن سمجھتے ہوں ایسا بھی نہیں تھا وہ مسلمانوں

کے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ لیکن کسی اور کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر نہیں۔

لیکن زمانہ ہمیشہ دبے پاؤں آگے بڑھتا ہے اور اس کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی نئی نسل اور سیاسی بیداری

اب مسلمانوں کی نئی نسل ابھر رہی تھی جو علوم جدیدہ سے بہرہ ور تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی، اپنے لیے اپنی قوم کے لیے، اپنے مستقبل کے لیے۔ اور اس ابھرتی نسل کو مائل بہ غروب ستارے۔ یعنی عہد قدیم کے لیڈر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ اگر ایسا کرتے تو خود ختم ہو جاتے، اور دوسرے اس لیے کہ اگر نوجوانوں کے جوش کو قابو میں نہ رکھتے تو حالات نازک صورت اختیار کر لیتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ وفاداری اور نیازمندی سے انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ مشرقی بنگال کا صوبہ حاصل ہوا تھا، وہ بھی اب خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو سیاسی اصلاحات کی تیسری قسط نافذ ہو جائے گی، اور مسلمان صرف کف افسوس مل کر رہ جائیں گے۔

ہندو ایک بہت بڑی قوت بن چکے تھے۔ اتنی بڑی قوت کہ اس کے خالق صناع اور موجد۔ انگریز۔ تک اس سے خائف رہنے لگے تھے۔ بنگال تقسیم کرنے کے بعد اس قوت کا بھیانک روپ ان کے سامنے آ گیا تھا۔ دہشت پسندی، بم، توڑ پھوڑ، قاتلانہ حملے، برطانوی مال کا مقاطعہ، سدیشی مال کی ترویج یہ ایسے تیر و پیکاں تھے جنھوں نے انگریزوں کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔

کانگریس ہمیشہ تقسیم عمل پر عامل رہی ہے، اور خود قومیت متحدہ کے جامۂ زرنگار میں ملبوس رہتی ہے اور حسب ضرورت اور حسب موقعہ کسی ہندو فرقہ پرست جماعت کو آگے بڑھا دیتی ہے۔ تاکہ اپنا بھرم قائم رہے، اور اس بھرم سے خوب فائدہ اٹھایا جائے۔ اور فرقہ پرست ہندو جماعت سے وہ وکالیات

ہندوؤں کے لیے کرائے جا سکیں جنھیں وہ خود زبان پر بہ مصلحت اور ناپسندی نہیں کرتی۔ چنانچہ "مہا منڈل" کے نام سے ۱۹۰۰ء میں مہاراجہ بردوان نے سارے بنگال کے ہندوؤں میں ایک نیا جذبہ، ایک نئی فرقہ پرست جماعت قائم کر کے فتنہ پیدا کر دیا۔ مہاراجہ بردوان نے وید مقدس ہاتھ میں لے کر ایک ایک گھر پر دستک دی۔ اور لاکھوں ممبر بنا لیے۔ یہ جماعت ایک حقیر اقلیت یعنی مسلمانوں کی دست برد سے ہندوؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ پھر ۱۹۰۶ء میں "مہا منڈل" نے ایک نیا روپ اختیار کیا، یعنی "ہندو مہا سبھا" کے نام سے عالم وجود میں آگیا۔ تقسیم بنگال کو رد کرنے کے لیے "یونائیٹڈ بنگال پارٹی" پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ اب مہا سبھا نے بھی بنگال کی شعلہ خیز سرزمین میں قائم ہو کر نیا مورچہ قائم کر لیا، اور تقسیم بنگال کا زخم تو اتفاق سے اتنا کاری تھا کہ کانگریس بھی برافگندہ نقاب ہو گئی، یعنی اس نے بھی کھل کر تقسیم کی مخالفت کی۔

حکومت خود اختیاری کا مطالبہ

غرض کہ کانگریس ہمیشہ سے تقسیم عمل پر عامل رہی ہے۔ تقسیم بنگال کی مخالفت کر کے اس مورچے کی کمان اس نے ہندو فرقہ پرست جماعتوں کے حوالے کر دی، اور خود جمہوریت کے نام پر ہندو حکومت کے منصوبے بنانے لگی۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں کانگریس کے اغراض و مقاصد کو واضح کرنے کے لیے جو اسٹینڈنگ کمیٹی کانگریس نے قائم کی تھی، اس سے مخاطب ہوتے ہوئے دادا بھائی نے کہا:۔

> "تمام بات ایک لفظ میں ختم ہو سکتی ہے، یعنی مملکت متحدہ برطانیہ اور اس کی دوسری نوآبادیات کی طرح سلف گورنمنٹ یا سوراجیہ ہمارا مطالبہ ہے!"

پھر کانگریس نے ایک باقاعدہ ریزولیوشن بھی منظور کر لیا جس کے ذریعے مطالبہ کیا۔

"سلف گورنمنٹ کا وہ آئین جو دوسری نوآبادیوں کو دیا گیا ہے، ہندوستان میں بھی رائج کیا جائے!"

کتنے معصوم اور سادہ الفاظ ہیں، لیکن اپنے مضمرات کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے کس درجہ ہلاکت آفرین!

ذرا ریزولیوشن کی تحلیل کیجیے:-

سلف گورنمنٹ یعنی حکومت خود اختیاری جن نوآبادیات میں رائج تھی، وہاں ایک قوم بستی تھی، لہٰذا اکثریت کی حکومت تھی۔ لیکن ہندوستان مجموعہ اقوام تھا، یہاں درجنوں قومیں بستی تھیں۔ جو اپنی تہذیب، روایت اور فکر کے اعتبار سے نہ صرف اکثریت سے الگ بلکہ متغایر تھیں۔ ان اقلیتوں کو، ایک قوم کا حصہ بنا کر کانگریس اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس پوزیشن کو ملک سب سے بڑی اقلیت تو کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔

گریہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

نوآبادیات کی طرح سلف گورنمنٹ مانگنے کا راز یہ تھا اور اسی لیے کانگریس نے آزادیٔ کامل کا مطالبہ اب تک نہیں کیا تھا کہ اسے مسلمانوں سے خطرہ تھا۔

"اس کی چنگاری میں ہے اب تک شرار آرزو"

لہٰذا اس بلا سے چھٹکارا پانے کی بہترین صورت یہ تھی کہ حکومت ہندو کے ہاتھ میں ہو۔ اور برطانوی فوج "باغیوں" کی سرکوبی کے لیے موجود رہے۔

ہندو اگرچہ قوت و طاقت حاصل کر چکے تھے، لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، سول وار کی صورت میں مسلمانوں سے عہدہ برآ ہو سکتے، لہٰذا انگریزوں کی سرپرستی لازمی اور ضروری تھی۔

لوکل بورڈوں اور لیجس لیٹو کونسل میں، نامزدگی اور مخلوط انتخاب کا سلسلہ قائم تھا۔ اور مسلمانوں کو اس سے بہت نقصان پہنچا۔ نامزدگی کی فہرست میں وہ مسلمان آتے تھے۔ جو بھی خواہِ برطانیہ ہوں اور مخلوط انتخاب کے ذریعے صرف وہ مسلمان کامیاب ہوتے تھے جو ہندو رائے دہندگان کا اعتماد حاصل کر سکتے ہوں، مسلمان اس صورتِ حال سے بددل تھے۔ اس بددلی کے زہر کا تریاک بھی سلف گورنمنٹ میں پوشیدہ تھا۔

ہندوؤں کی انقلابی سرگرمیوں کے باوجود برطانوی حکومت ہندوؤں کو نواز رہی تھی۔ اس سے ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا اور وہ سمجھتے تھے سلف گورنمنٹ کا مطالبہ ایسی کمزور اور اطاعت کیش حکومت سے منوا لینا کچھ دشوار نہیں ہوگا۔

بمبئی گزٹ کا تبصرہ

یہ تھے وہ حالات جو مسلمانوں کے سامنے تھے اور جنھوں نے مسلمانوں میں بددلی پیدا کر دی تھی اور وہ حکومت سے مایوس ہو کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی فکر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی بددلی اور مایوسی کی تحلیل کرتے ہوئے "بمبئی گزٹ" نے جو ایک اینگلو انڈین اخبار تھا۔ بڑا اچھا تبصرہ کیا تھا۔ اس نے (۱۹۰۶ء) میں لکھا تھا:۔

"گزشتہ بیس سال میں مسلمانوں نے کانگریس میں شامل ہونے سے گریز کیا۔ پھر بھی سرد مہری کے شکار رہے۔ اس عرصے میں کانگریس نے خوب ترقی کی۔ جو کانگریسی لیڈر (حکومت برطانیہ کی) مخالفت کرنے میں سب سے زیادہ سرگرم تھے وہ کونسلوں میں ممبر بھی مقرر ہوئے۔ انھیں خطابات اور انعام بھی ملے۔ ایک ہندو کچھ عرصے تک ہائی کورٹ کی ججی کرنے کے بعد کانگریس کا لیڈر بن گیا۔ اور "سر" کے خطاب سے نوازا گیا......... ایسے واقعات تو بہت ہیں کہ کانگریس کے صدر ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہوئے ہیں۔ تعلیمی کمیشن میں دو ہندوستانی ممبر تھے

ایک نے یونی ورسٹی بل کی مخالفت کی، جو ہندو تھا۔ اور خطاب پا گیا۔
دوسرے نے جو مسلمان تھا۔ سید عماد الملک بلگرامی بل کی موافقت کی
اسے کوئی صلہ نہیں ملا۔ پرنس آف ویلز علی گڑھ گئے تو وہاں کے ارباب
کار اکرام و اعزاز سے محروم رہے، حالانکہ دوسرے مقامات پر ہندوؤں کو
فراخ دلی سے نوازا گیا، اگر قدر دانی اور انعامات صرف شورش پیدا کرنے
والے ہی حاصل کریں تو مقام حیرت نہیں، اگر مسلمان یہ کہیں کہ آؤ ہم بھی
ناراضگی کی شورش میں حصہ لیں، اور انعام و اکرام میں حصہ بٹائیں، چنانچہ
آج بہت سے ایسے مسلمان کانگریس میں نظر آئیں گے، جو دس بارہ سال
پہلے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے!"

یہ تجزیہ پورے طور پر صحیح ہو یا غلط اس سے بحث نہیں، لیکن اس میں مسلمانوں کی بدلی اور مایوسی کی جو تصویر اور ہندوؤں کے نوازنے اور مورد کرم بنانے کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً امر واقعہ ہے۔

وفد شملہ بہر حال اب مسلمان خاموش نہیں رہ سکتے تھے، انھیں اپنے حقوق کے لیے میدان میں آنا تھا، اور التجا و استدعا کا راستہ ترک کر کے مطالبے کی دنیا میں قدم رکھنا تھا،

اس سلسلے میں مسلمانوں نے دو قدم اٹھائے اور دونوں ان کے مستقبل پر اثر انداز ہوئے۔

پہلا قدم تھا جداگانہ انتخاب کا!

نواب محسن الملک نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرنے کے لیے پہلے تو ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمانوں سے تبادلۂ خیال کیا، پھر وائسرے سے ملاقات کا وقت مانگا وقت مل گیا، یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء۔

عماد الملک سید حسین بلگرامی نے سر برآوردہ مسلمانان ہند سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد ایڈریس کا مسودہ تیار کیا، ۱۶ دسمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں مسلم ہندوستان کے نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا، جس میں مسودے پر مفصل بحث ہوئی، اور اسے منظور کر لیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ وقد کے لیڈر سر آغا خان ہوں، جو اس وقت تک صرف ایک مذہبی رہنما تھے۔ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، لیکن محسن الملک نے عامۃ المسلمین کی پاسبانی کے لیے انھیں آمادہ کر لیا، اور وہ سیاست میں حصہ لینے لگے۔

وائسرائے کی خدمت میں ایڈریس

لارڈ منٹو وائسرائے اور گورنر جنرل کی خدمت میں بہ مقام شملہ ایڈریس پیش کیا گیا، جس کے خاص خاص نکات یہ ہیں۔

- بلدیات، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور کونسلوں میں جو ممبر انتخاب سے لیے جاتے ہیں ان میں قومیت کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب مقرر کر دیا جائے۔
- سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ پیہم ناانصافی ہو رہی ہے، لہٰذا سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کا تناسب طے کر دیا جائے۔
- ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں مسلمان جج بھی لیے جائیں۔
- ہر قوم کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا جائے یعنی انتخاب مخلوط نہ ہو بلکہ جداگانہ ہو اور مسلمانوں کی نشستیں مقرر کر دی جائیں۔
- یونی ورسٹیوں کی سینٹ اور سنڈیکیٹ میں بھی مسلمانوں کو موثر نمائندگی دی جائے
- امپیریل کونسل کے مسلمان ممبروں کو صرف مسلم رائے دہندگان منتخب کریں
- محمڈن مسلم یونی ورسٹی کے قیام میں مسلمانوں کی امداد کی جائے۔

ایڈریس کا جواب۔ لارڈ منٹو نے ایڈریس کے جواب میں ایک طویل تقریر کی

انھوں نے کہا :-

"میں آپ سے متفق ہوں کہ تمام سیاسی امور کو جو مغرب میں رائج ہیں، یہاں بھی ان کی افادیت سے قطع کر کے رائج کرنے کی کوشش کی جائے، آپ نے کہا کہ کسی طریقہ نمائندگی کو خواہ وہ میونسپلٹی سے متعلق ہو یا لوکل بورڈ یا کونسل سے مسلمانوں کو ان کا حصہ دیا جائے، نیز انتخاب کے جو حلقے اس وقت قائم ہیں، ان سے بہ مشکل یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کس مسلمان کا انتخاب کریں اور اگر اتفاقاً کوئی مسلمان منتخب بھی کیا جائے تو یہ اسی صورت میں ہوگا کہ وہ اپنی رائے پر ایسی اکثریت کی رائے کو ترجیح دے جو خود اس کی اپنی قوم کی مخالف ہے اور اس طرح کا منتخب شدہ مسلمان ہرگز اپنی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا، مجھے آپ کی طرح یقین ہے کہ اس طرح کا انتخاب نہ صرف ناکام ہوگا بلکہ مبنی بہ فساد ہوگا، عام رعایائے ہندوستان طریقہ نمائندگی سے بالکل ناآشنا ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانان ہند کو مطمئن رہنا چاہیئے، جہاں تک میرا تعلق اس ملک کے انتظام و انصرام سے، مسلمانوں کے قومی حقوق و مقاصد کا پورا لحاظ کیا جائے گا!"

اس طرح گویا حکومت برطانیہ کے سب سے بڑے نمائندے نے جداگانہ انتخاب کا حق مسلمانوں کے لیے تسلیم کر لیا، اور اصلاحات سیاسی کی تیسری قسط کے ساتھ وہ نافذ بھی ہو گیا۔

وفدِ شملہ کا ردِ عمل ہندوؤں کی شورش کا سب سے بڑا مرکز بنگال تھا یہاں کے اخبارات نے خاص طور پر مسلمانوں کے وفد اور وائسرائے کے جواب کو "نفاق آمیز" قرار دیا۔

اس وفد اور وائسرائے کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرے روز ٹائمز (لندن) نے ایک اداریہ لکھا، اس میں بعض پتے کی باتیں بھی تھیں، مثلاً یہ کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی، یہاں مختلف اقوام آباد ہیں!

ٹائمز نے اپنے اداریہ میں کانگریس اور مسلمانوں کے سیاسی نظریات کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا اور خوب کہا:-

کانگریس کی جملہ تجاویز دراصل انگریزوں کے خیالات ہیں جنھیں کانگریسی لیڈر بغیر سوچے سمجھے اپنے ہاں بجنسہ دہراتے رہتے ہیں، اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا خیال اچھوتا ہے، جو انگریزوں کے سیاسی اداروں کو اپنے حسب حال بنانا چاہتے ہیں"

شملہ وفد کے بارے میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلسل غلط فہمیاں پیدا کیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انگریزوں کی شرارت تھی بھی تو چھوٹی سی، ان کی سب سے بڑی شرارت تو کانگریس تھی، جسے انھوں نے قائم کر دیا تھا، جس کی سرپرستی کی تھی، جس کے مندوبین کو گورنران صوبہ دعوتیں دیتے تھے، جس کے صدر اور عہدیداروں کو بائی کورٹ کی جج ملتی تھی، سر کا خطاب ملتا تھا، اور متعدد طریقوں سے مورد لطف و کرم قرار دیا جاتا تھا، اس کے برعکس وفد شملہ کے کسی رکن کی اس طرح سے سرفرازی نہیں کی گئی، انگریزوں نے جب کانگریس کو جنم دیا تو انھیں بیدار مغز فرماں روا قرار دیا گیا، پٹابی سیتارامیہ نے اپنی تاریخ کانگریس میں ایک پورا باب "ہمارے برطانوی دوست" کے عنوان سے سپرد قلم فرمایا ہے، کیا مسلم لیگ کی تاریخ میں بھی وہ جب بھی لکھی جائے، اس قسم کے باب کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ مسٹر ہیوم سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، اٹیلی اور لارڈ ریڈکلف تک کانگریس کے "برطانوی دوستوں اور محسنوں کی طویل فہرست طول شب فراق سے ٹکر کھاتی ہے، لیکن کیا ہمارے پاس

اس طرح کی کوئی چھوٹی سی فہرست بھی ہے ؟ الحمدللہ نہیں !

بہرحال پہلا مرحلہ طے ہوا، مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا حق حاصل کرلیا، یہ دیر میں اور مشکل سے ملا، لیکن مل گیا، یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ نمائندہ میرا ہو اور اس کے انتخاب میں آپ بھی شامل ہوں، آخر کیوں ؟ کس اصول سے ؟ لیکن اب تک یہ ستم ظریفی کشورِ ہند میں ہندوؤں کی دھاندلی اور انگریزوں کی شرارت سے نافذ تھی اب ختم ہوئی ۔

مسلم لیگ کا قیام

اس پہلے مرحلے کا لازمی اور قدرتی نتیجہ دوسرا مرحلہ تھا یعنی ایک ایسی سیاسی جماعت کا قیام جو مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کرسکے اور ایوان حکومت اور بزم غیر میں ان کی نمائندگی کرسکے ان کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوں ان کا ازالہ کرانے کی جدوجہد کرسکے ۔

آغا خان نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت بڑے مدبر بھی تھے، انھوں نے ۴؍اکتوبر ۱۹۰۶ء کو، ایک گشتی خط جاری کیا، جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ بلاتوقف ہر صوبے میں مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مقاصد کے تحفظ کے لیے انجمنیں قائم کی جائیں اور پھر آل انڈیا بنیاد پر ایک مرکزی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے، جس سے صوبائی جماعتیں وابستہ ہوں ۔

اس ضرورت کو آغا خان سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ نے محسوس کیا جو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ مشرقی بنگال کے نئے صوبے کے خلاف جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندو متحدہ بنگال کا محاذ قائم کیے ہوئے ہیں اور اس تقسیم کو منسوخ کرانے کے درپے ہیں اور اپنے مساعی کو کامیاب بنانے کے لیے اور ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو پھر سے غلام بنا لینے کے لیے ہر قسم کی دہشت انگیزی پر اتر آئے ہیں، اور گو انگریز اب تک تقسیم کے اصول پر قائم ہیں، لیکن

ان کے لب و لہجے کی کمزوری ان کے عزم کی کمزوری ظاہر کر رہی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم منسوخ ہو جائے گی، لہٰذا مسلمانوں کی ایک مرکزی سیاسی جماعت کا قیام ناگزیر ہے تاکہ ہر صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی جماعتی طور پر کوشش کا آغاز کر دیا جائے، چنانچہ قبل اس کے کہ آغا خان کی تجویز بارآور ہوتی نواب سلیم اللہ خان نے ایک اپیل مسلمانانِ ہند کے نام شایع کی کہ

"آل انڈیا مسلم کنفڈریشن" کے نام سے جلد از جلد ایک جماعت قائم کی جائے، یہ اپیل ۹ نومبر ۱۹۰۶ء کو شایع ہوئی اور دسمبر کی تعطیلات کرسمس میں مسلمان رہنماؤں کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی گئی، ساتھ ساتھ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کو بھی نواب صاحب نے مدعو کیا، نواب صاحب کی اس مستحسن تجویز پر سر آغا خان نے صاد کیا۔

نواب سلیم اللہ خان کی دعوت پر ڈھاکہ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم ہندوستان کے نمائندوں کا ایک زبردست اجلاس ہوا، اس سے قبل مسلمانوں کا اتنا بڑا اور کامیاب سیاسی اجتماع ہندوستان کے کسی گوشے میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس اجتماع کی صدارت نواب وقار الملک نے کی، اور اسی موقع پر آل انڈیا مسلم کنفڈریشن کے بجائے آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہو گئی۔

جو لوگ اس اجلاس میں شریک ہوئے، ان میں اصحاب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ

۲۔ ہز ہائی نس سر آغا خان

۳۔ سر علی محمد خان، راجہ محمود آباد۔

۴۔ سر علی امام

۵۔ مسٹر عزیز مرزا

۶۔ مولانا محمد علی

۷۔ نواب محسن الملک

قیام مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد

اس اجلاس میں مسلم لیگ کے اسباب قیام پر غور کرنے کے بعد اس کے ابتدائی اغراض و مقاصد حسب ذیل طے پائے۔

• مسلمانان ہند کا حکومت برطانیہ اور حکومت ہند سے وفادارانہ تعلقات رکھنا (یہ ٹیپ کا بند کانگریس بھی گزشتہ بیس سال سے یعنی ۱۸۸۵ء سے اب تک ہر اجلاس میں زیادہ سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ دہراتی آ رہی تھی اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا۔)

• مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور اس سلسلے میں ہر ضرورت حکومت کے کان تک پہنچانا، اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا۔

• مسلم لیگ کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندوستان کے دوسرے فرقوں سے اتحاد کی کوشش کرنا۔

چند تجاویز

اس طرح مسلم لیگ قائم ہوئی اس ابتدائی اجلاس میں جسے اجلاس تاسیس کہنا چاہیئے چند تجویزیں بھی منظور کی گئیں۔

تقسیم بنگال مسلمانوں کے لیے مفید ہے اسے قائم رکھا جائے اور اس کے خلاف جو مظاہرے ہو رہے ہیں ان کو نظر انداز کیا جائے۔

نیشنل کانگریس نے نیشنل ہونے کے باوجود تقسیم بنگال سے اختلاف کیا ہے اور احتجاجی تجویز منظور کی ہے۔ مسلم لیگ کا یہ اجتماع اس سے اختلاف کا اظہار کرتا ہے۔

وقار الملک مسلم لیگ کے سکریٹری اور محسن الملک جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔

نواب وقار الملک مسلم لیگ کے سکریٹری تھے ان کا یہ کام تھا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں میں مقبول بنائیں۔ چنانچہ اجلاس ڈھاکہ کے تین ماہ بعد انھوں نے علی گڑھ کالج کے طلبا کے سامنے مسلم لیگ اور اس کے اغراض و مقاصد پر ایک دل نشین تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہماری تعداد ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں صرف ایک خمس ہے۔ اگر کسی وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، مال، آبرو، مذہب ہر چیز خطرے میں ہو گی۔"

اس تقریر کو ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں کانگریس نے اپنے نیشنل ازم کو اور زیادہ ثقیل کر دیا ہے لیکن بھارت کے مسلمانوں پر کیا آج وہی حادثہ نہیں گزر رہا ہے جس کی پیش گوئی وقار الملک نے ساٹھ سال پہلے کی تھی۔

سرسید سے لے کر قائداعظم تک سب کی فراست ایمانی نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا، کہ ہندو نیشنل ازم درحقیقت ہندو سامراج کا دوسرا نام ہے۔ اور تلک سے لے کر جواہر لال نہرو تک سب اسی جذبے کے تحت کام کرتے رہے تھے۔

وقار الملک نے اپنی اس تقریر میں مسلمانوں کو تاج برطانیہ سے وفاداری کا مشورہ بھی دیا تھا جس کا تواتر و یقین کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے ذکر ہوتا رہا ہے لیکن ایک چیز یہ حضرات ہمیشہ فراموش کرتے رہے ہیں یعنی۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

کانگریس نے مسلم لیگ کے قیام سے پہلے اور مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہمیشہ تاج برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کیا۔ صدرانِ کانگریس اپنا زورِ خطابت پہلے اسی پہ صرف کرتے تھے۔ اس کے بعد شکوہ و شکایت کا دفتر کھولتے تھے پہلی

جنگ عظیم کے وقت حالت یہ رہی کہ گاندھی جی جنوبی افریقہ میں رضا کارانہ طور پر برطانوی فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے۔

مسلمان کمزور تھے، پسماندہ تھے، اقلیت میں تھے۔ وہ اگر برطانوی راج کو اپنے لیے وقتی طور پر ضروری اور لازمی سمجھتے تھے، تو ایک بات بھی تھی۔ لیکن کتنا بڑا عجوبہ تھا یہ بھی کہ ملک سب سے بڑی اکثریت جو مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی۔ شاید مسلمانوں کو کچلنے میں تعاون کے لیے۔ انگریزی راج کو ضروری خیال کرتی رہی۔ ۱۹۲۸ء میں جب پنڈت موتی لال نہرو وزیر ہند کے چیلنج کا جواب دینے پر مامور ہوئے۔ اور انھیں آزاد ہندوستان کے دستور کی تسوید و تحریر کا کام سونپا گیا تو انھوں نے بھی ہندوستان کے لیے درجۂ نوآبادیات تجویز کیا تھا۔ آزادیٔ کامل کا نام زبان پر لانے کی ہمت نہ پڑی۔ اور وہ ایک سرپھرا مسلمان لیڈر حسرت موہانی تھا جس نے بھرے اجلاس میں ہدفِ تمسخر بننے کے باوجود موتی لال کے خلاف تجویز ملامت پیش کر دی۔ کہ جو شخص آزادیٔ کامل کے بجائے درجۂ نوآبادیات کا قائل ہو، وہ ہمارا نہ لیڈر ہے، نہ ہمارے ملک کا نمائندہ وہ کسی احترام کا سزاوار نہیں وہ اس قابل ہے کہ اس کے خلاف تجویز عدم اعتماد منظور کی جائے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ جس اجلاس میں نہرو رپورٹ منظور ہوئی۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال۔ سوبھاش چندر بوس، جے۔ ایم سین گپتا، بپن چندر پال، سروجنی دیوی، ڈاکٹر انصاری اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ جو آج آزادی کے ہیرو اور دیوتا مانے جاتے تھے۔ پھر اگر ۱۹۲۸ء تک کانگریس درجۂ نوآبادیات کی قائل رہی یعنی آزادی زیرِ سایہ برطانیہ اس کا مقصود رہا۔ تو پھر مسلمان کیوں معتوب قرار دیے جائیں؟ وہ تو اپنے وجود کے لیے ایک تیسری طاقت کے محتاج بھی ہو سکتے تھے لیکن کروڑوں کی تعداد رکھنے والی سب

سے بڑی اکثریت بھی تیسری طاقت کی محتاج ہوسکتی تھی ؟ یہ چیز بیک وقت
المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی !

کانگریس اور مسلم لیگ کی سرگرمیاں

عوامل و محرکات

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کا زمانہ گوناگوں واقعات و حوادث پر مشتمل ہے اس دور میں مسلمانوں کو بہت سے مصائب برداشت کرنا پڑے، بہت سے صدمے سہنا پڑے۔ بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فرنگی حکومت انھیں بساطِ حکومت کا ایک مہرہ سمجھتی تھی۔ جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا۔ برادران وطن ان کی ذہنی اور عملی پسماندگی سے مطمئن تھے اور انھیں ایک اقلیت سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہ تھے۔ خود مسلمانوں میں بھی کئی طبقے تھے، جو آپس میں برسرِ جنگ تھے۔ ایک معزز طبقہ وہ تھا اور اس میں علماء و امراء بھی شریک تھے جو حکومتِ برطانیہ کو "آیت من آیات اللہ" سمجھ رہا تھا۔ اور اس کے ظلِ عاطفت کو سایۂ الٰہی سمجھتا تھا۔ اور اس کے ہر ظلم و تعدی کو ادائے ترکانہ سمجھ کر جان و مال نثار کرنے کو تیار رہتا تھا۔ ایک دوسرا طبقہ قدیم اور جدید دانش وروں کا تھا۔ یعنی علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب یہ حکومت کی چیرہ دستیوں کے خلاف حق و صداقت کی آواز بلند کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ اور اس راستے میں ہر قربانی اور ایثار کے لیے سربکف تھا۔ اس کی دعوت تھی خود اعتمادی کی، یہ مسلمان

قوم میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتا تھا اس کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ نہ حکومت برطانیہ سے آس لگائیں، نہ ہندوؤں سے مدد طلب کریں۔ اس لیے کہ حقوق دریوزہ گری سے نہیں ملتے، چھینے جاتے ہیں۔ جس میں اپنے حقوق چھیننے کی طاقت نہیں، اس کے لیے تو بہترین جگہ گوشۂ قبر ہے۔ ایک اور گروہ تھا جو غیر مشروط طور پر کانگریس کے ساتھ تھا اور مسلمانوں کے اس روگ کا علاج اس کے نزدیک صرف یہ تھا کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ اپنی جداگانہ قومیت کو فراموش کر دیں اور اپنی ملی انفرادیت کے حق سے دست بردار ہو جائیں۔

مسلم لیگ اگرچہ قائم ہو چکی تھی اور اپنی مقدور بھر کوشش کر رہی تھی، کہ مسلمان ایک مستقل قوم کی حیثیت سے اپنا مقام پیدا کر لیں اپنی قوت حاصل کر لیں کہ انگریز نہ انھیں آلۂ کار بنانے کی جرأت کریں نہ ہندو انھیں نظر انداز کر سکیں۔ لیکن مسلم لیگ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کی آئیڈیالوجی پر جملہ مکاتب فکر کا یا جمہوریت کا یا دانشور طبقے کا اتحاد نہیں ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی الگ بولی بولتا تھا، اور مسلم لیگ کا پلیٹ فارم لاؤڈ اسپیکر کی طرح اس گفتار کو نشر کر دیتا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک کی ان سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال لیں جو متوازی طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے ظہور پذیر ہوئیں۔ پھر دوسرے عوامل و محرکات کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر گفتگو کی جائے گفتگو کا آغاز ہم کانگریس سے کرتے ہیں۔۔

کانگریس کی سرگرمیوں پر ایک نظر

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں کانگریس بھی باہمی جنگ آزمائی کا شکار رہی۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس سورت میں منعقد ہوا لیکن افراتفری کے عالم میں معطل کر دیا گیا کانگریس اب اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی

قوت آزمائی کا مرکز بنتی جا رہی تھی۔ دونوں میں سے ہر گروہ اس پر قبضہ کر لینے کی فکر میں تھا۔ انتہا پسندوں کی رہنمائی کٹر فرقہ پرست تلک کے ہاتھ میں تھی، اور اعتدال پسند سر بیندر ناتھ بنرجی کے ساتھ تھے۔ یہ معطل شدہ اجلاس ۱۹۰۸ء میں بہ مقام مدراس منعقد ہوا۔ منٹو مارلے اصلاحات کا آغاز ہونے والا تھا۔ کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا، بائیکاٹ کا لفظ بھی زبان پر نہیں لایا گیا۔ سدیشی کی حمایت میں ضرور اظہار خیال کیا گیا لیکن نرم الفاظ میں، جارحانہ طور پر نہیں۔

۱۹۰۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بہ مقام لاہور منعقد ہوا اس اجلاس کے صدر مدن موہن مالوی تھے جو تلک کی طرح وطن پرست بھی تھے اور فرقہ پرست بھی ان کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ مسٹر اینڈریوز جیسے محب ہند نے ان کے بارے میں لکھا :-

"مالوی جی کو ہندو مہاتما جی سے بھی زیادہ چاہتے ہیں آپ نے قوم کی گراں بہا خدمت کی ہے جس سے لاکھوں قلوب متاثر ہیں۔"!

مورخ کانگریس ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ نے مالوی جی کو خراج تحسین ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"مالوی جی نے ۱۸۸۶ء کے اجلاس کانگریس میں تقریر کی اس وقت سے وہ کانگریس کے خادم بھی ہیں اور مخدوم بھی!"

اور یہ کانگریس کا خادم اور مخدوم، مہاسبھا شدھی سنگھٹن اور مسلم آزار تحریکوں کا سب سے بڑا لیڈر بھی بنا رہا۔ مگر نہ اس کی قوم پروری کبھی زیر بحث آئی، نہ وطن دوستی۔!

بہر حال اس اجلاس میں مالوی جی نے جو تجویزیں منظور کرائیں، ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں :-

۱۔ مذہب کی بنا پر انتخابات کی مذمت ۔ یعنی جداگانہ انتخاب پر برہمی۔

۲۔ مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ نمائندگی دینے پر اظہار ناراضگی ۔ یعنی اگر مسلمانوں کو کہیں تھوڑا سا پاسنگ حاصل ہو تو وہ چھین لیا جائے ۔

۱۹۱۰ء میں کانگریس کا اجلاس بہ مقام الہ آباد منعقد ہوا اس اجلاس کے صدر محترم ایک انگریز (سابق آئی۔ سی۔ ایس) سر ولیم ویڈبرن تھے۔ موصوف کے متعلق مسٹر گوکھلے کا بیان ہے :۔

"آپ کی باوقار اور بزرگانہ شکل رشیوں کی سی ہے۔ اس قدر جمیل اور اثر انگیز کہ قلم اس کا مرقع کھینچنے سے قاصر ہے۔ ایسی شخصیت صرف قابل تعظیم ہی نہیں بلکہ پرستش کے قابل ہے۔!"

اس قابل پرستش صدر کی صدارت میں بھی یہ جداگانہ انتخاب کے خلاف زہر اگلا گیا، اور تجویز منظور ہوئی، گویا کانگریس اب متعین اور واضح طور پر مسلمانوں کی ملی انفرادیت کے خلاف مورچہ بنا چکی تھی ۔ قومیت متحدہ کے نام پر!۔

۱۹۱۱ء کانگریس کے لیے نشاط، مسرت، کامیابی اور کامرانی، خوش بختی اور فتوحات کا سال تھا! ۔

اس سال حکومت برطانیہ نے اپنے گزشتہ اعلانات کے برخلاف، بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی۔ اور اس طرح مسلمان منہ دیکھتے رہ گئے ۔ نگریستن بہ سوئے فلک یا گریستن!۔

کانگریس نے بجا طور پر برطانیہ کی اس پسپائی کو اپنی فتح مبین قرار دیا۔ اس اجلاس کے صدر پنڈت بشن نرائن تھے۔ فاتحانہ شان و جلال کی جھلک ان کے خطبہ صدارت میں موجود ہے، ارشاد ہوا :۔

"وہ آدمی جو کسی ذاتی یا فرقہ وارانہ فائدے کی غرض سے کوئی ایسا

کام کرنے پر آمادہ ہو جس کے باعث "اتحاد" میں رکاوٹ پیدا ہو جائے یا جو "بے معنی" سیاسی مسائل پیدا کرنے کی کوشش کرے یا ان "رفتہ گزشتہ" ناخوش گوار واقعات کی یاد تازہ کرنے لگے۔ وقت نے جن پر اپنے "فیاض" ہاتھوں سے فراموشی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ ملک کا سب سے بڑا دشمن ہے!"

ان استعارات و تشبیہات کا مقصد وحید یہ تھا، مسلمانو! انگریزوں نے تمھیں ٹھکرا دیا۔ وہ ہمارے سامنے جھک گئے۔ تم تقسیم بنگال پر پھولے نہیں سماتے تھے مگر ہم نے اس تقسیم کو منسوخ کرا دیا۔ ہماری قوت، اور اپنی ناچاری کا اعتراف کر لو، اور خاموش رہو۔

۱۹۱۲ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بہ مقام بانکی پور (پٹنہ) منعقد ہوا صدر اجلاس مسٹر مدھو لگر تھے، جنھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں متحدہ قومیت پر ایک زوردار وعظ کہا۔ اور جداگانہ فرقوں میں خود غرضی اور نفسانفسی کی جھلک پر اظہار الم فرمایا۔ اس اجلاس نے جو تجویزیں پاس کیں، ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

(۱)۔ "امپیریل (مرکزی) اور صوبہ جاتی کونسلوں میں منتخب شدہ اراکین کی کثرت ہو" تاکہ ہندو اکثریت اور زیادہ واضح ہو جائے، نامزدگی کی صورت میں، جو محروم القسمت مسلمان، آجایا کرتے تھے وہ بھی نہ آسکیں۔

(۲) لوکل باڈیز میں جداگانہ انتخاب کی مذمت کی گئی۔ اس لیے کہ جداگانہ انتخاب کی صورت میں مسلمان اپنے معتمد نمائندوں کو بھیج سکتے تھے اور یہ صورت ناقابل قبول تھی۔ لہٰذا مخلوط انتخاب کا نعرہ پھر زور و شور سے لگایا گیا کہ مسلمان اگر کوئی منتخب بھی ہو سکے تو وہ جو ہندوؤں کو خوش رکھ سکے۔

اس سال ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر جب کہ ایک جلوس میں ہاتھی پر سوار وہ چاندنی چوک (دہلی) سے گزر رہے تھے۔ ایک بنگالی دہشت پسند نے بم پھینکا، مہاوت ہلاک ہوگیا۔ لاٹ صاحب زخمی ہوئے، کانگریس کی طرف سے وائسرائے کو ایک تار بھیجا گیا جس میں اس حادثہ فاجعہ پر دلی رنج وغم کا اظہار کیا گیا تھا

۱۹۱۳ء سے پہلے کانگریس کا پہلا مسلمان صدر ۱۸۸۷ء میں منتخب ہوا تھا، یہ بدرالدین طیب جی تھے بے شک وہ نیشنلسٹ تھے۔ لیکن مسلمان بھی تھے اور اسلامی اقدار کے حامل بھی، اب پچیس سال کی تلاش وجستجو کے بعد، کانگریس نے ایک مسلمان صدر ڈھونڈ نکالا، جسے دیکھ کر تلک اور مالوی تک کہہ اٹھے:۔

آمد آں بارے کہ ما می خواستیم

یہ بزرگ نواب سید محمد بہادر (مدراس) تھے، ۱۸۹۴ء میں کانگریس کو اپنے شرف قدوم سے انھوں نے نوازا تھا، ۱۹۰۳ء میں کانگریس کا جو اجلاس بہ مقام مدراس منعقد ہوا تھا، اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، اس کے بعد دس برس کی ریاضت شاقہ کے بعد کانگریس کے اجلاس کراچی کے صدر بن گئے خطبۂ صدارت میں فرمایا، اور کیا خوب فرمایا:۔

"شروع ہی سے کانگریس کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم بنے۔ چنانچہ کسی طرح کی جانب داری یا فرقہ پرستی سے متاثر ہوئے بغیر مجموعی طور پر اہل ہند کی پاس داری کرتی رہی ہے، گزشتہ چند سالوں میں ملک کے اندر عظیم تبدیلیاں ہوئی ہیں اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر کانگریس کی پیدا کردہ بیداری کا نتیجہ ہیں، ہمیں قوی امید ہے کہ یہ لہر پوری روانی سے آگے بڑھتی رہے گی اور نسل، رنگ اور مذہب کی تمام غیر فطری اور مصنوعی

رکاوٹوں کو دور کردے گی"!

اس اجلاس میں مسٹر باسو نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

"مہاراجہ اشوک نے ہندوستان کو جو عظیم مرتبہ عطا کیا تھا، اور اکبر اعظم نے ہندوستان کا جو نقشہ قائم کیا تھا، مستقبل کا ہندوستان اس سے بھی زیادہ مضبوط اور عظیم المرتبت ثابت ہوگا"!

گویا کانگریس نے اب اپنے آپ کو بالکل بے نقاب کردیا، اس نے:-

- مخلوط انتخاب کی مخالفت کرکے ہندو فرقہ پرستی کی قیادت کی۔
- تقسیم بنگال کی مخالفت کرکے مسلمانوں کے دل پر زخم لگایا۔
- تقسیم بنگال کی تنسیخ پر چراغاں کا اہتمام کرکے ثابت کیا کہ خالص ہندو جماعت ہے۔
- قومیت متحدہ کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔
- مستقبل کے ہندوستان کو اشوک اور اکبر کے ہندوستان سے بھی زیادہ مضبوط اور عظیم المرتبت بنانے کا عہد کیا!

اس کے بعد بھی وہ "غیر فرقہ پرست" جماعت تھی ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر ایک نظر

آیئے اب مسلم لیگ کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بہ مقام کراچی سر آدم جی پیر بھائی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ صدر محترم نے مسلمانوں کو

- تجارت اور کاروبار میں حصہ لینے کی تلقین کی۔

- تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا۔
- مسلمانوں کو انفرادی اور جماعتی طور پر شریعت اسلام کی پابندی کا مشورہ دیا۔
- کانگریس یا اس کے طرز عمل کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ میں تفرقہ پیدا ہوا، سر شفیع اور سر فضل حسین الگ الگ لیگ کی سربراہی کے مدعی تھے، آخر علی گڑھ میں جسٹس شاہ دین نے دونوں لیگوں کو ملا دیا۔ شفیع فضل حسین اختلافات ختم ہو گئے۔ لیگ کا سالانہ اجلاس بہ مقام امرتسر، سر علی امام کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

- اس اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ جداگانہ انتخاب کو مقامی اداروں تک وسیع کیا جائے۔
- سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو تناسب آبادی کے اعتبار سے جگہ دی جائے۔

ساتھ ساتھ عمومی طور پر ہندوستان کا مفاد بھی پیش نظر رکھا گیا، چنانچہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ :-

- پریوی کونسل میں کم از کم دو ہندوستانی شامل کیے جائیں۔
- جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں سے اظہار ہمدردی کیا گیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ انھیں انسانیت سوز قواعد و ضوابط کا نشانہ بنانے کی پالیسی ترک کر دے۔

۱۹۰۹ء میں لیگ کا سالانہ جلسہ بہ مقام دہلی منعقد ہوا، پرنس آف ارکاٹ، سر غلام علی نے صدارت کی، اس جلسے میں بھی :-

۱- جداگانہ انتخاب کی وسعت پر زور دیا گیا۔

۲۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کسمپرسی کی شکایت کی گئی۔

۳۔ ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) کے ہندوستانیوں کی تائید کی گئی۔

مسلم لیگ علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل ہوگئی۔ عزیز مرزا سکریٹری منتخب ہوئے۔ وقار الملک نے اپنی سرگرمیاں علی گڑھ کالج تک محدود کر دیں کیوں کہ پیرانہ سالی کے باعث اس تندہی سے لیگ کا کام نہیں کر سکتے تھے جس طرح ایک نوجوان کر سکتا تھا۔

۱۹۱۰ء میں مسٹر نبی اللہ کی زیر صدارت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام ناگپور منعقد ہوا۔

مسلم لیگ شروع ہی سے کانگریس کے استعماری مقاصد کو سمجھ رہی تھی۔ اب تک وہ صرف مسلمانوں کی اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ تھی۔ اب اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ہندوؤں کی سامراجی ذہنیت کے خلاف بھی صف آرا ہوگئی۔

اس اجلاس کی دو اہم خصوصیتیں ہیں، ایک وہ میموریل جو اچھوتوں سے متعلق وائسرائے کو بھیجا گیا۔ دوسری وہ تجویزیں جو نہایت اہم مسائل کی حامل تھیں۔

میموریل کا واقعہ یوں ہے کہ لیگ کونسل نے وائسرائے کو ایک عرض داشت بھیجی کہ اچھوتوں کو ہندوؤں میں شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ مذہبی اور تمدنی اعتبار سے وہ مختلف ہیں، جب انعامات، مناصب، اور ملازمتوں کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہندو قوم ان کی تعداد سے فائدہ اٹھاتی ہے اس اعداد و شمار کے پھیر سے اچھوت بھی مبتلائے مصیبت ہیں، اور مسلمان بھی۔ اگر اچھوتوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع دیا جائے تو وہ بہت جلد اپنی صلاحیت ثابت کر دیں گے یہ بڑی انقلابی تجویز تھی۔

مسلم لیگ کا اچھوتوں پر، یہ بہت بڑا احسان تھا، اچھوتوں کے سب سے بڑے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر، ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ محض انسانیت دوستی کے جذبے سے سرشار ہو کر، اور برہمنیت کا طلسم توڑنے کے لیے مسلم لیگ نے یہ قدم اٹھایا، اگر انگریزوں نے اس اہم عرض داشت پر توجہ کی ہوتی ۔ اور اچھوتوں میں سیاسی شعور موجود ہوتا، تو یقیناً ہندو اکثریت کا طلسم ٹوٹ جاتا اور ہندوستان میں ہندو راج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ لیکن اچھوت جاہل اور جذبۂ خودی سے بے بہرہ تھے۔ انگریز ایک نئی مصیبت اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے، صرف بنگال کی تقسیم نے انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ اب اگر وہ اچھوتوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لیتے تو نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ لہٰذا انھوں نے بھی اس مطالبے پر توجہ نہ کی۔ لیکن بہر حال مسلم لیگ نے ثابت کر دیا کہ وہ اچھوتوں کی ہمدرد ہے، اور برہمنیت کے استبداد اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہے۔

اس اجلاس میں جو خاص تجویزیں منظور ہوئیں۔ یہ ہیں۔

۱ — جداگانہ انتخاب کی توسیع۔

۲ — وقف علی الاولاد کی تجویز۔

۳ — پنجاب میں ہندی اور پنجابی کو اردو کے مقابلے میں لانے کی جدوجہد کے خلاف احتجاج۔

سید نبی اللہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں بڑے کام کی بات کہی:۔

"جداگانہ انتخاب کے نفاذ پر برادرانِ ہند جو اتحاد ٹوٹ جانے کے خطرے کا الارم دے رہے ہیں، یہ سب غلط باتیں ہیں، ہم کاغذی اتحاد نہیں چاہتے، بلکہ مفاد وطن کی خاطر قلبی اتحاد کے متمنی ہیں۔ کیا

ہمارے ہندو دوست اپنی پائیدار اور مستقل اکثریت سے مطمئن نہیں ہیں؟ آخر وہ اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ ہماری نمائندگی کو حسد کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اپنی بھاری اکثریت کے نشے میں ہماری کمزور آواز کو دیکھ کر ہم پر مسلط ہو جانا چاہتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ زیبا ہے؟ کیا صلح کے یہی ڈھنگ ہوتے ہیں۔؟۔

مسلم لیگ اگرچہ، نیازمندی کے حدود سے آگے بڑھ کر، مطالبات کی دنیا میں داخل ہو چکی تھی۔ لیکن حکومت پر نکتہ چینی سے اب تک گریز کیا جاتا تھا۔ اس مرتبہ حکومت پر سنجیدہ لیکن صریحی طور پر شد و مد سے اعتراضات کیے گئے۔ صدر نے خطبۂ صدارت میں، سول سروس کے افسروں کو "نفاق" کا ذمے دار قرار دیا۔ مصارف جنگ کی روز افزوں زیادتی پر بھی خطبۂ صدارت میں حکومت کو ٹوکا گیا، صدر کی طرف سے تجویز پیش کی گئی کہ سر ولیم وڈبرن، آغا خان، اور سید امیر علی کی رائے کے مطابق ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس تجویز کے مطابق کچھ روز بعد یعنی جنوری ۱۹۱۱ء میں بہ مقام الہ آباد، ایک اتحاد کانفرنس ہوئی بھی، لیکن مالوی جی اور لبشن نرائن در کی متعصبانہ ذہنیت نے اسے ناکام بنا دیا، اور تاریخ نے اپنے سینے میں یہ حیرت انگیز واقعہ محفوظ کر لیا کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت نے از خود دستِ صلح دراز کیا۔ لیکن ملک کی سب سے بڑی اکثریت اور ملک کی سب سے بڑی "نیشنل" سیاسی جماعت کانگریس نے اس دستِ صلح کو جھٹک دیا۔

تقسیمِ بنگال کی منسوخی اور مسلم ہند کا ردِ عمل

دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ

کا اعلان، شاہی دربار دہلی میں کیا گیا،!

یہ انگریزوں کی غداری، بے وفائی، خود غرضی، اور منافقت کی تاریخ میں شاہکار واقعہ ہے۔ وزیر ہند نے، گورنر نے، پارلیمنٹ نے، وزیر اعظم برطانیہ نے، بار بار شدت اور وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ یہ طے شدہ مسئلہ ہے۔ اب تقسیم منسوخ نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہندو عوام اور ہندو خواص (کانگریس) کی شورش اور دہشت پسندی نے انگریز حکومت کو مرعوب کر دیا۔ اور اپنے عہد و میثاق کو اس نے یکسر فراموش کر دیا۔

اس اعلان کے تین ماہ بعد یعنی مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس نواب ڈھاکہ سر سلیم اللہ کی زیر صدارت منعقد ہوا، نواب صاحب اس حادثے سے بہت دل گیر تھے۔ اس غم میں چند روز بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نواب صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

"بنگال کی تقسیم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک نافذ رہی۔ ہمارے دشمنوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس تقسیم سے مسلمانان مشرقی بنگال کے پامال شدہ حقوق نمایاں حیثیت اختیار کر لیں گے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمیں حصۂ رسدی سے کچھ بھی زیادہ نہیں ملا تھا۔ لیکن یہ بھی برادران وطن نے اپنے لیے نقصان دہ سمجھا۔ انھوں نے تقسیم کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بدترین جرائم کا ارتکاب کیا، قتل کیے، ڈاکے ڈالے، ولایتی سامان کا بائیکاٹ کیا۔ ان شورشوں میں مسلمانان بنگال نے حصہ نہیں لیا۔ کیونکہ وہ کاشت کار ہیں اور زمینوں کے مالک، ہندو مالکان اراضی نے اپنے مسلمان کسانوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی شورش میں شریک ہوں۔ مگر وہ اپنے پاؤں پر

کلہاڑی کیوں مارتے؟ نہیں شریک ہوئے۔ اس چیز نے ہندو مسلم تلخی کی صورت اختیار کر لی۔ گورنمنٹ برطانیہ نے اس کی آڑ لے کر تقسیم منسوخ کر دی، اور ہم سے مشورہ تک نہ کیا۔!"

ان الفاظ میں کتنا درد اور کتنا سوز ہے۔!

نواب وقار الملک جو سیاست سے کنارہ کش ہو کر علی گڑھ کالج کے لئے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے تھے، اس موقعے پر خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے تحریر فرمایا:۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانے کے تھی، جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے، اور ان کو اس سے کتنی تکلیف ہوگی؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مسلم لیگ کے تاسیسی اجتماع میں، سر علی محمد خان راجہ محمود آباد بھی شریک تھے، راجہ صاحب اگرچہ یوپی کے تقریباً سب سے بڑے تعلقہ دار تھے۔ لیکن مسلم مفاد کے معاملے میں نہ وہ اپنے تعلقے کی پرواکرتے تھے۔ نہ حکومت کے نشۂ قوت کی، وہ ہر قربانی کے لیے ایسے موقعے پر تیار ہو جاتے تھے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

راجہ صاحب نے اس واقعہ ہائلہ کے کچھ عرصے بعد مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں بحیثیت صدر مجلسِ استقبالیہ جو خطبہ ارشاد فرمایا بڑا معرکہ آرا تھا۔ انھوں نے کہا:۔

"مشرقی بنگال میں ہمارے بھائیوں کو یقین دلایا گیا کہ تقسیم بنگال ایک طے شدہ امر ہے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ تقسیم کی تحریک کو جاری

رکھیں۔ وائسرائے اور لارڈ مارلے نے اعلان کیا تھا کہ تقسیم بنگال ایک لازمی امر ہے۔ خواہ کتنے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے یہ قائم رہے گی۔ اسلامی بنگال کو بارہا باور کرایا گیا کہ اسے ہندو بنگال کے ماتحت نہیں رکھا جائے گا۔ ہندوؤں کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود مسلمانوں نے حکومت کے مواعید پر بھروسہ کیا اور پُرامن رہے۔ لارڈ منٹو نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس فیصلے کو بدل دے۔ ہندوستان کے کسی رہنما کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس فیصلے کی تنسیخ کبھی ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن ان تمام اعلانوں کے بعد ہوا کیا؟ یہ کہ جوں ہی برطانوی مفاد کا یہ تقاضا ہوا کہ اس فیصلے کو بدل دیا جائے، تو ایک لمحے کے لیے بھی برطانیہ کو اپنے مواعید کا خیال نہیں آیا، اور مسلمانوں کی داستانِ وفا یک قلم فراموش کر دی گئی!"

راجہ صاحب کے یہ الفاظ ایک تاریخی حقیقت ہیں۔

بہرحال تقسیم کی تنسیخ نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش اور جذبہ پیدا کر دیا۔ اب تک وہ شورشوں سے الگ رہتے تھے اب طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب تک وہ صرف وفادار اور نیازمند تھے۔ اب وہ حریف پنجہ شکن بنتے نظر آ رہے تھے۔ اب تک وہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے اس لیے دور رہتے تھے کہ پسماندہ تھے، جاہل تھے، مقہور و معتوب تھے۔ اب ان کی پسماندگی ختم ہو رہی تھی۔ تعلیم میں انھوں نے نمایاں حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حکومت کے قہر و عتاب کو خاطر میں لانے کو وہ بالکل تیار نہ تھے۔ اور قدرت کی طرف سے حالات بھی کچھ ایسے پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ کہ مسلمان ایک زندہ

فعال اور کارگزار قوم کی حیثیت سے میدان میں اتر آئیں۔

مسلم لیگ کے مقاصد میں تبدیلی

اپریل ۱۹۱۲ء میں روس نے مشہد مقدس میں حضرت امام رضاؑ کے مزار پر گولہ باری کی۔ اس حادثے نے مسلمانانِ ہند کو غم و غصے سے بھر دیا۔ مسلمانوں نے ۱۹۱۱ء کی ناکامی کے باوجود اور کانگریس کے دل شکن رویّے کے باوجود پھر ہندو اکثریت کی طرف دستِ صلح بڑھایا۔ کہ کانگریس اگر اپنے اندر ذرا سی لچک پیدا کرلے اور مسلمانوں کی انفرادیت کو چیلنج نہ کرے تو آزادیٔ ہند کے لیے وہ اس سے تعاون کو تیار ہیں۔ مسٹر عزیز مرزا کا انتقال ہو چکا تھا، اب ان کی جگہ سید (بعد میں سر) وزیر حسن لیگ کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے لیگ کے دستور میں ترمیم کے لیے ایک گشتی مراسلہ جاری کیا۔ جس کا مفاد یہ تھا، کہ لیگ کے اغراض و مقاصد میں دو چیزیں بڑھا دی جائیں :-

۱۔ ہندوؤں سے برادرانہ تعلقات۔

۲۔ سلف گورنمنٹ۔

یعنی از روئے دستور مسلم لیگ ہندو مسلم اتحاد اور حکومت خود اختیاری کی داعی بن گئی ہے۔ کیا یہ کوئی معمولی انقلاب تھا؟۔

۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۱۳ء میں یہ مقام لکھنؤ سر محمد شفیع کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس سالانہ انعقاد پذیر ہوا۔

وزیر حسن کے گشتی مراسلے کے جواب میں مختلف صوبوں سے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں ترمیمیں موصول ہوئیں۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لیگ کونسل کے سامنے جدید دستور پیش ہوا۔ صدارت، صدر مستقل آغا خان نے کی یہ جدید دستور منظور ہو گیا۔ پھر مارچ ۱۹۱۳ء کے اجلاس عام (لکھنؤ) میں بھی اس پر مہر تصدیق ثبت

ہوگئی ۔ اس اجلاس میں مسز سروجنی نائیڈو اور کئی دوسرے ہندو زعما نے بھی شرکت کی مسٹر مظہر الحق نے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق جو تجویز پیش کی وہ بھی منظور کر لی گئی ۔

یہ اجلاس ہندو مسلم اتحاد اور سیاسی جدوجہد میں کانگریس کے دوش بدوش سعی جدوجہد کے مرحلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ سر شفیع نے جو خطبۂ صدارت دیا، وہ بھی بہت اہم تھا ۔ انھوں نے فرمایا :-

"جو لوگ اپنے آپ کو ہندوستانیوں کا نمائندہ، خیال کرتے ہیں۔
ان کا فرض ہونا چاہیئے کہ حکومت کو حقائق سے آگاہ کرتے رہیں ۔"

پھر سر شفیع نے یہ قطع پڑھا ۔

دوست آنست کہ اوعائب دوست
ہم چو آئینہ رو بہ رو گوید !،
نہ کہ چوں شانہ، از ہزار زباں،
در پس پشت مو بہ مو گوید !

۱۹۱۳ء کے اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن کی تحریک سے مسٹر (بعد میں قائد اعظم) مسلم لیگ کے ممبر بھی بن گئے ۔ ورنہ ابھی تک وہ "فرقہ وارانہ سیاست" سے بالکل الگ تھلگ رہے تھے ۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں پر جو زیادتیاں فرنگی استعمار اور ہندو سامراج کی طرف سے ہو رہی ہیں ۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو مضبوط کیا جائے ۔ اور کوئی صورت ایسی پیدا کی جائے کہ ہندو مسلمان مل کر غلامی کا جوا اتار پھینکیں چنانچہ مسلم لیگ میں شرکت کے باوجود وہ کانگریس میں بھی مقتدر حیثیت سے شریک رہے ۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ایسٹر کی تعطیلات میں منعقد ہوا تھا۔ پھر اسی سال کرسمس کی تعطیلات میں بہ مقام آگرہ منعقد ہوا۔ صدر اجلاس سر ابراہیم رحمت اللہ تھے۔

یہ اجلاس متعدد اعتبارات سے بے حد اہم تھا اور صدر اجلاس کی شخصیت نے اسے چار چاند لگا دیے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد جو لیگ سے خفا تھے۔ سر ابراہیم رحمت اللہ کا خطبۂ صدارت سن کر (اجلاس میں وہ بھی شریک تھے) اس درجہ متاثر ہوئے کہ الہلال میں ایک مقالہ لکھ کر انھوں نے نہایت شاندار الفاظ میں ابراہیم رحمت اللہ کے تدبر، فراست۔ حب وطن اور جذبۂ ملی کو خراج تحسین پیش کیا۔

اس اجلاس پر چونکہ یہ باب ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کے ان حادثات کا ذکر بھی مختصراً کر دیا جائے۔ جو اس اثنار میں پیش آئے، پھر اس اجلاس کی تاریخی اہمیت پر ایک نظر ڈالی جائے۔

درحقیقت ۱۹۱۳ء کے اس اجلاس پر ایک پورا دور ختم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، ایک دور کا خاتمہ اور ایک نئے دور کا آغاز بہت سے اہم مطالب کا حامل ہے۔

کانگریس سے مسلم لیگ کی مایوسی
اور
عزمِ عمل

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کا دور اگرچہ زمانی اعتبار سے زیادہ طویل نہیں ہے، لیکن یہ اتنا ہمہ پہلو ہے کہ اس کی کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - یہ تاریخ ساز دور ہے اس دور میں برطانیہ عظمیٰ کی تاریخ نے نئی کروٹ لی، اس دور میں ہندوؤں نے چولا بدلا اور اسی دور میں مسلمان انگڑائی لے کر اٹھنے کی تیاریاں کرنے لگے، اس دور میں تشکیل تاریخ ہند، اور اقوام ہند کے مراحل طے ہو رہے تھے تشکیل ابھی نہیں ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس طویل دور کو مختصر طور پر پیش کرنے کے باوجود، اس کے ہمہ پہلو خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

آغا خاں کی صدر کانگریس سے ملاقات

اس دور کی ایک نمایاں تر خصوصیت یہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات، جو تعلیمِ جدید کے بامقصد ثمرات تھے زیادہ واضح طور پر نظر کے سامنے آگئے اور یہ بات یقیناً ہر دور میں یاد رکھی جائے گی کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے ہمیشہ اتحاد و اتفاق باہمی کے سلسلے میں نہ صرف پہل کی بلکہ زیادہ سے زیادہ مراعات

بھی اپنی طرف سے اکثریت کو دینی منظور کیں۔

مسٹر ڈبلو۔ زیڈ برن، سنہ ۱۹۱۰ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ہز ہائی نس سر آغا خان نے جو سیاست ملکی و ملّی میں اب حصہ لینے لگے تھے۔ انگلستان میں مسٹر زیڈ برن سے ملاقات کی اور انھیں یہ بات سمجھائی کہ جب تک ہندو مسلم اتحاد عمل میں نہیں آجاتا۔ کانگریس اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہندوستان کی آزادی کوئی ایک قوم خواہ کتنی ہی بڑی، کتنی ہی دہشت پسند، کتنی ہی تشدد پرست اور کتنی ہی بم اور پستول سے مسلح ہو، نہیں حاصل کر سکتی، اس کے لیے اقوام ہند کا بالعموم اور ہندوؤں مسلمانوں کا اتحاد بالخصوص لازمی اور ناگزیر ہے آغا خان نے صدر کانگریس کو مشورہ دیا، اور اصرار کے ساتھ ان سے التجا کی کہ جلد از جلد ایک "سربراہ کانفرنس" منعقد کی جائے اور اس میں تمام اختلافی مسائل زیر بحث لائے جائیں، اور کوئی آبرومندانہ اور قابل قبول حل تلاش کر لیا جائے۔

صلح کانفرنس صدر کانگریس نے اس تجویز سے اتفاق کیا، اور جیسا کہ کسی گزشتہ باب میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، بہ مقام الہ آباد ایک صلح کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں ساٹھ ہندو نمائندے، اور چالیس مسلمان مندوب شریک ہوئے۔ جن میں سر بیندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، سندر لال، پنڈت مالوی، سر تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو، مسٹر دبعد میں لارڈ) سنہا مہاراجہ دربھنگہ، آغا خان، وقار الملک، سر ابراہیم رحمت اللہ، مسٹر جناح، مسٹر حسن امام، مولانا محمد علی، اور حکیم اجمل خان، وغیرہم خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔

ذرا ان مندوبین کے ناموں پر غور کیجیے۔ ہندوؤں میں جو نام نظر آرہے ہیں یہ سب (مسلمانوں کی طرح) چوٹی کے لوگ تھے، ان کا علم، ان کا خلوص، ان کی

ذہانت، ان کی مقبولیت، ان کی معاملہ فہمی، ان کی سیاست دانی، ان کا حب وطن، ان کا جذبۂ آزادی، ان کی تمنائے اتحاد، ہر چیز شک و شبہ سے بالا تھی۔

کانفرنس کی ناکامی کے اسباب

لیکن اس کے باوجود، یہ صلح کانفرنس ناکام ہوئی، اور اس ناکامی کا سہرا صرف انہی معاملہ فہم، دور اندیش ہندو زعماء کے سر تھا۔

یہ سب کچھ کر سکتے تھے مگر:-

- قومیت متحدہ کے تصور سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے۔
- جداگانہ انتخاب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
- گاؤکشی کا حق، انگریزوں کو دے سکتے تھے، لیکن مسلمانوں کو نہیں دے سکتے تھے، چھاؤنیوں میں ہزاروں تندرست و توانا گائیں ہر روز سپاہیوں کے لیے ذبح ہوتی تھیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن دبلی، پتلی، کمزور اور ازکار رفتہ گائیں اگر مسلمان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے یا کسی تقریب کے سلسلے میں ذبح کرتے تو، اس پر خون کی ندیاں بہانے سے گریز نہیں کیا جا سکتا تھا۔
- بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں، مخلوط انتخاب رائج تھا، جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا تھا مگر اس کی تلافی، یعنی جداگانہ حق نیابت پر کوئی راضی نہ ہوا۔
- وہ زمانہ اب گزر چکا تھا۔ جب مسلمان نالائق تھے، جاہل تھے، نااہل تھے، اب ان میں ہر قسم کی مطلوبہ قابلیت اور عقل موجود تھی۔ مگر انھیں سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں تحفظات دینے پر بھی، موتی لال اور سر سپرو جیسے روادار، عالی ظرف اور غیر متعصب لوگ راضی نہ ہوئے،
- اردو اور ہندی کی کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی، اردو ہندی کا حق غصب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا حق غصب کیا جائے

لیکن ہندی، اردو کی لاش پر اپنا ایوان تعمیر کرنا چاہتی تھی، مگر یہ حضرات، جو نہ جن سنگھ کے لیڈر تھے نہ مہاسبھا کے، اپنے آپ کو اس کے لیے بھی تیار نہ کر سکے۔ کہ اردو کی حق رسی کریں۔ اس سلسلے میں ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کی مادری زبان اردو تھی۔ اور ان کی فصیح و بلیغ اردو سن کر، لطف آجاتا تھا موتی لال اور پنڈت مالوی کی اردو تقریریں میں نے سنی ہیں، حق یہ ہے کہ نفاست، بلاغت، ادائی اور شگفتگی، آمد اور اثر آفرینی میں یہ کسی مسلم خطیب کے خطبۂ شیریں سے کم نہیں ہوتی تھیں اور بسر تیج بہادر سپرو تو ان ہندوؤں میں تھے، جن کے گھر میں ہندی بولنا جرم تھا۔ جو اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی "ناقابل تقسیم میراث" سمجھتے تھے، جو اردو کے بہترین سخن فہم تھے۔ نہ جانے کتنے اردو شاعران کے دامن دولت سے وابستہ رہے جو مرتے وقت تک، یعنی تقسیم ہند کے بعد تک کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔ جو فیس کی بیش قرار رقم موکل کو واپس کر دیتے تھے۔ مگر ہندی میں لکھی ہوئی مسل کا مطالعہ نہیں کرتے تھے، جن کی شرافت، عالی حوصلگی، اور بے تعصبی سورج کی طرح روشن ہے۔ لیکن اپنے ہم قوموں کو اردو کے ساتھ انصاف کرنے پر وہ بھی رضامند نہ کر سکے۔

اس کے برعکس آغا خان، وقار الملک، اور دوسرے مسلمان زعیم پوری سچائی کے ساتھ اس پر تیار تھے کہ انصاف کے مسلمہ اصولوں کے مطابق یہ مسئلہ طے کر لیا جائے۔

• — اس کانفرنس میں آریہ سماج - جو ایک نوخیز ہندو جماعت تھی، کی اشتعال انگیزیاں بھی زیر بحث آئیں۔ اس جماعت کی کتاب مقدس "ستیارتھ پرکاش" میں دوسرے انبیاء اور بزرگان دین کا ذکر اتنے اشتعال انگیز، حقارت آمیز، اور تکلیف دہ انداز میں کیا گیا ہے۔ جسے رکاکت ابتذال اور دریدہ دہنی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، اس جماعت نے اسلام کے بہت سے اصول قبول

کر لیے ، لیکن اسلام کے اور مسلمانوں کے خلاف اس کی فتنہ طرازیاں زور شور اور جوش و خروش کے ساتھ جاری رہیں۔ اصل ہندو مت یعنی سناتن دھرم کے مطابق، کوئی غیر پیدائشی ہندو، ہندو مت قبول نہیں کر سکتا کہ یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے، لیکن اس نئے فرقے نے، نہ صرف ہندو مت کی تبلیغ کر کے غیر ہندوؤں کو ہندو بنانا شروع کر دیا بلکہ مسلمانوں کو مرتد کرنے کے سلسلے میں ایسے طریقے اختیار کیے جو مسلمہ اقدار انسانی کے خلاف تھے، مسلمان بھی جوابی کارروائی کر سکتے تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے اس لیے کہ ان پر اینٹیں شیش محل میں بیٹھ کر پھینکی جا رہی تھیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ چاہا کہ رواداری اور شرافت کے ساتھ معاملات طے ہو جائیں۔ ہر مذہب کی تبلیغ کو آزادی ملے۔ لیکن دل آزاریوں سے اجتناب کیا جائے ، مگر اس صلح کانفرنس میں ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی، آریہ سماج کے خلاف لب کشائی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔

● — باجے کا مسئلہ بھی وقت کا ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔" یعنی عین اذان اور نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے زور زور سے باجے بجاتے ہوئے گزرنا۔ اس سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوتا تھا۔ اور نوبت خوں ریزی اور فساد تک پہنچ جاتی تھی ، بڑی آسان بات تھی، اگر نماز اور اذان کے وقت باجہ بجانے سے احتراز کیا جاتا۔ لیکن یہ صلح کانفرنس اس مقصد میں بھی ناکام ہوئی۔

مذکورہ مسائل کے علاوہ، اور بھی کئی مسائل تھے، جو پیش کیے گئے، لیکن مسلمانوں کی صلح جوئی اور آشتی پسندی کے باوجود ایک نہ سنی گئی، حالانکہ کانفرنس کے افتتاح کے وقت ہز ہائی نس سر آغا خان نے جو معرکہ آرا تقریر، اتحاد کی ضرورت پر کی تھی ، اسے خراج تحسین پیش کرنے میں پیش پیش تھے، مگر عملاً کچھ نہ ہو سکا۔ یہ کانفرنس جو آغا خان

کی مساعی سے منعقد ہوئی تھی بری طرح ناکام ہوئی۔

یوپی کے کانگریسی ہندوؤں میں پنڈت بشن نرائن جو بڑے معاملہ فہم اور عالی ظرف سیاست داں تھے۔ ذاتی طور پر متعصب اور ناروادار بھی نہیں تھے لیکن اس سال بریلی میں، یوپی یونائیٹڈ کانفرنس کا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا وہ ان کی قوم کے مزاج کا آئینہ دار تھا۔ انھوں نے سرسید جیسے بے نفس، پاک نہاد اور صلح جو زعیم کو بغیر کسی جھجک کے "کوتاہ اندیش سیاست داں" کا خطاب اپنی بارگاہ عالی سے مرحمت فرمایا۔ مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب پر بھی بجلی کی طرح چمکے اور بادل کی طرح گرجے۔

اب تک صورت احوال یہ تھی کہ شمع فرنگ کے پروانوں میں ہندو اور مسلم سیاست داں برابر کے شریک تھے۔

فرق صرف ایک تھا!

مسلمان اپنی بے بسی، کمزوری اور مجبوری کے باعث غیر مشروط وفاداری کا ثبوت دیتے چلے آئے تھے۔

اور ہندوؤں کی وفاداری "مشروط" تھی۔ یعنی اگر حکومت برطانیہ ان کے مطالبات منظور کرتی رہے، ہندوستان کی جملہ اقلیتوں کو ان کی تحویل میں دے دے اور انھیں ان کی قسمت کا مالک بنا دے، قومیت متحدہ کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل نہ ہو، خود حکومت کرے، لیکن آلہ کار کے طور پر انھیں استعمال کرتی رہے۔ کوئی ایسا اقدام نہ کرے، جس سے ان کا قومی مفاد مجروح ہوتا ہو، تو۔

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لیکن اگر اس ڈگر سے ہٹ جائے تو پھر وفادار اور اطاعت شعار ہندوؤں کو باغی، دہشت پسند اور انقلابی بننے میں بھی کوئی تامل نہیں تھا۔

بنگال کی تقسیم پر، بنگال کے ہندوؤں نے ہندوستان کے ہندوؤں نے اور انگریزوں کی قائم کی ہوئی ہندو سیاسی جماعت کانگریس نے جو طوفان بدوش، ہلاکت خیز اور قیامت آفریں احتجاج کیا۔ اس نے حکومت برطانیہ کو بدحواس کر دیا، اور وہ اپنے اس مستقل فیصلے کو بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ہز امپیریل میجسٹی نے بہ نفس نفیس ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا اور دربار تاج پوشی کے موقعے پر، تقسیم کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان نے، ہندوستان کے مسلم سیاست دانوں کو غرق حیرت کر دیا اور ہندو سیاست دانوں کو نشاط بے کراں کی دولت عطا کر دی، ان مباحث پر گزشتہ ابواب میں اشارے کر چکا ہوں، اور اس سال کے صدر کانگریس کے خطبۂ صدارت کا سرسری ذکر بھی کر چکا ہوں، جو خطبۂ صدارت سے کہیں زیادہ قصیدہ نامہ مدحیہ تھا، ساری تلخیاں، ساری باغیانہ حرکتیں، ساری بدگمانیاں ساری لن ترانیاں، ختم اور تجدید وفا کا نیا دور شروع ہو گیا چنانچہ ارشاد فرمایا۔

"بلاشبہ برطانوی راج کے اندر ہمیں لاتعداد نعمتیں حاصل ہیں، انگریزوں کے ہمدردانہ رویے کو ہم فراموش نہیں کر سکتے، ان کے مثالی انصاف و عدل، اور حق پرستی پر میرا غیر متزلزل اعتقاد ہے، ہمیں اس راج میں اتنا امن و امان، اور راحت و آسائش ملی ہے، جو دیگر ممالک میں بھی نصیب نہیں ہے۔ انگریز عوام کی فلاح و بہبود میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس حکومت نے سب کو مذہبی آزادی عطا کر رکھی ہے۔ ریل، تار، ڈاکخانہ اور ہزاروں طرح کی چیزیں ہمیں انگریزوں ہی سے ملی ہیں، جو ہماری ترقی کا سبب ہیں۔ انگریزوں نے سب سے بڑا تحفہ جو ہمیں عطا کیا ہے، وہ تعلیم ہے، خدا کا شکر ہے، اور مجھے فخر ہے کہ میں برطانوی رعایا ہوں اور میں بے تامل کہہ سکتا ہوں کہ برطانوی قوم خدا کا بہت

بڑا عطیہ ہے، انگلستان ہی ایک ایسا ملک۔ جو ان لوگوں پر حکومت کرنا جانتا ہے جن میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔"

برطانوی راج دن کی روشنی کی طرح صاف اور روشن ہے، وہ امن اور ترقی، علم اور آزادی کا نشان ہے وہ ایک وعدہ ہے ایک ضمانت ہے، اس حکومت کو کمزور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تہذیب انسانی کو کمزور کر رہے ہیں۔ تنسیخ تقسیم بنگال ایک ایسا عطیہ ہے، جس کے لیے نہ صرف بنگال بلکہ تمام ہندوستان بلکہ معظمہ کا زیر بار احسان ہے، چونکہ بنگال کا مسئلہ سارے ملک کا مسئلہ ہے، اس کی فتح پر سچ پر انصاف کی فتح ہے۔ اس نے ہمارے اذعان کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے کہ برطانوی راج خدا کی طرف سے ہے۔"

یاد رکھیے۔ یہ تقریر کسی سرکار پرست کی نہیں ہے۔ کسی معمولی کانگریسی لیڈر کی نہیں ہے، یہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کانگریس کے صدر والا قدر کا خطبہ ہے، کیا بدنام اور "سرکار پرست" مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت بھی کبھی اس تک آسکا تھا؟

نواب وقار الملک کے خون کے آنسو

اور بقول مسٹر امبکا چرن مزمدار جس وقت ہر شخص کا دل تاج برطانیہ کی وفاداری اور عظمت کے جوش نشاط میں رقص کر رہا تھا، اور برطانوی سیاست کی انصاف پسندی کے گن گا رہا تھا! "اس زمانے میں ایک اور دل تھا جو خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک اور قلم تھا، جس سے الفاظ کے بجائے جگر کے ٹکڑے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو رہے تھے۔ جنوری ۱۹۱۲ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں نواب وقار الملک نے اس حادثۂ المیہ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ الحاق (مشرقی و مغربی بنگال)

عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے۔ ارباب سلطنت برطانیہ نے یکے بعد دیگر الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، اب الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی!"

آگے چل کر وقار الملک نے ایک بڑے پتے کی بات کہی — وہی بات جو بعد میں قائداعظم اور تحریک پاکستان کے علم برداروں کی زبان پر جاری ہوئی، انھوں نے فرمایا:

"اس کارروائی سے حکومت نے مسلمانوں کی طرف سے نامناسب بے پروائی برتی۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی یہ فیلنگ پیدا ہونے لگی ہے کہ ہندوؤں سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مسلم لیگ کو اب خیرباد کہنا چاہیئے اور نیشنل کانگریس کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔"

ہم اس سے تو متفق ہیں کہ حکومت کی طرف سے ضرور ایسی کارروائی ہوئی ہے جس سے مسلمانوں کے دلوں کو واجبی طور پر صدمہ پہنچا ہے، لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ قومی شیرازہ منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔ ہماری علیحدگی کانگریس سے اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کو حکومت کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے ہماری علیحدگی کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں!"

یعنی کانگریس سے مسلمانوں کا ترک تعلق انگریز کی دوستی اور وفاداری میں نہیں تھا کہ اس کا نقطۂ نظر مسلم مفاد اور مسلم انفرادیت کے لیے تباہ کن تھا۔ اور مسلمان اس کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ انگریزوں کا وجود

بادل نخواستہ اس لیے گوارا کر رہے تھے کہ اس طرح کم از کم ان کی انفرادیت تو قائم تھی کانگریس میں شرکت کے صاف معنیٰ یہ تھے کہ ان کی ملی انفرادیت ختم ہو جائے دوسرے الفاظ میں وہ خود ختم ہو جائیں۔ دریا سمندر میں مل جانے کے بعد دریا نہیں رہتا۔ سمندر ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ مسلمان اگر ہندو اکثریت میں اپنے آپ کو مدغم کر دیتے، تو ان کا ملی وجود ختم ہو جاتا، وہ ہندو اکثریت کا ایک بے حقیقت حصہ بن جاتے۔

اسی ضمن میں حکومت کے فیصلۂ تنسیخ سے بددل اور مایوس مسلمانوں کی دل دہی کرتے ہوئے بھی نواب صاحب بڑے پتے کی بات کہتے ہیں۔

"یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مایوسیاں انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ اور یہ خیال کہ ہم کانگریس کے ساتھ شامل ہو جانا چاہتے ہیں اسی قسم کی مایوسیوں کا نتیجہ ہے جس کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہے لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت بھی نہیں دی جا سکتی۔"

لیکن مسلمان "خودکشی" بھی نہ کریں، یعنی کانگریس میں شریک بھی نہ ہوں، اور حکومت برطانیہ ان کے مفاد کو برابر مجروح کرتی چلی جائے۔ تو آخر راستہ کیا ہے؟ وہ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اس کا جواب بھی وقار الملک نے دیا ہے، اور بہت معقول دیا ہے:-

"یہ بات تو اب آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ ان واقعات (تقسیم بنگال کی تنسیخ وغیرہ) کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدے میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو حکومت پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے۔ اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے۔"

گویا وقار الملک صاف الفاظ میں مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔ اگر عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، اگر اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہو، اگر اپنے مفاد کی حفاظت کرنا چاہتے ہو تو انگریزوں پر بھروسہ نہ کرو اور کانگریس میں شریک ہو کر اپنا قومی وجود ختم نہ کرو، بلکہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرو اور دیکھ لو ہندوؤں نے اپنی قوت بازو پر بھروسہ کیا، اور تقسیم بنگال منسوخ کرالی۔ تم بھی اگر ان کی طرح اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرلو، ہمت و جرأت سے کام لو، اپنے حقوق برطانیہ سے بھی چھین سکتے ہو، اور ہندو اکثریت سے بھی۔ وقار الملک کی یہ آواز ۱۹۱۲ء میں بلند ہوئی، لیکن بے اثر نہ رہی، محمد علی، حسرت موہانی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، اقبال سب اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اور سب کی تعلیم و تلقین یہی تھی کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

نواب صاحب نے اپنے اس طویل مقالے میں آگے چل کر فرمایا:۔

"ہندوستان کے مسلمان اب بھی اگر خواب غفلت سے ہوشیار ہوں تو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ باوجود اپنی مردم شماری کی کمی کے دنیا کی ممتاز قوم شمار ہونے لگیں گے اور حکومت بھی آئندہ کسی کارروائی کے وقت لازمی طور پر ہمارے حقوق اور احساسات کا بھی کافی خیال رکھنے پر مجبور ہوگی۔ اس وقت حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے، ممکن ہے کہ مسلمانوں کو غفلت سے ہوشیار کرنے کی غرض سے ایک تازیانے کا کام دے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یحدث بعد ذلک امرا!"

ان سادے سے الفاظ میں، اس پیر مرد دانا نے جو پیش گوئی کی ہے، کیا وہ

صرف ۲۵ سال کے بعد، ایک سنگین حقیقت نہیں بن گئی ہے، یعنی اس تازیانے سے مسلمان چونکے اور بالآخر انھوں نے اپنی ایک آزاد اور خود مختار مملکت۔ پاکستان بنا کے دم لیا۔؟

برطانوی حکومت کی اس روش پر خود انگریزوں کو بھی حیرت تھی۔ چنانچہ سابق وائسرائے آف انڈیا۔ لارڈ منٹو نے دارالعوام میں اس مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہم نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ بنگال کی تقسیم ایک اٹل فیصلہ ہے، یہ یقین دہانی بار بار ہماری طرف سے ہوتی رہی، ہندوستان میں اراکین سول سروس میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا۔ جو یہ یقین کرتا ہو کہ برطانوی حکومت اپنے اس اٹل فیصلے کو مسترد بھی کر دے گی، اس طرح ہندوستانی سیاست داں بھی یہی خیال کرتے تھے، مگر تقسیم بنگال کی تنسیخ نے ثابت کر دیا کہ ناممکن بھی ممکن ہے۔"

وقار الملک تو پیرانہ سالی اور ضعف و علالت کے باعث ایک مشورۂ صائب دے کے گوشہ نشین ہو گئے، لیکن جو نئی بود جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ابھر رہی تھی۔ اس نے یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی، اور خودی و خود اعتمادی کا توشہ لے کر میدان عمل میں اتر آئی۔

عزیز مرزا کا گشتی مراسلہ

مسلم لیگ کا مرکز اب علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا، اور اس کے سکریٹری مسٹر عزیز مرزا منتخب ہو چکے تھے، مسلم لیگ نے قوت بازو کے بل پر حقوق حاصل کرنے اور مفاد کا تحفظ کرنے کی ٹھان لی، چنانچہ جن چیزوں کو لے کر وہ عوام میں آئی ان میں دو چیزیں خاص طور پر بہت نمایاں تھیں:۔

● ۔ بلدیات اور لوکل بورڈوں میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ،

۵۔ کریڈ (نصب العین) کی تبدیلی۔

لیگ کے سکریٹری نے جو گشتی مراسلہ اپنے ممبروں کے نام جاری کیا۔ اس میں دوسرے مسائل کے علاوہ جس چیز پہ بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ وہ یہ تھی:۔

"لوکل جماعتوں میں جداگانہ نیابت کی نسبت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بار بار ایجی ٹیشن کیا جائے۔ اور یہ بات حکومت کے ذہن نشین کر دی جائے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل جائز ہے اور اس باب میں ان کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔!"

لیکن جداگانہ نیابت پر اصرار کے یہ معنی ہرگز نہیں تھے کہ مسلمان ہندوؤں کے دشمن تھے۔ انھوں نے کبھی بھی یہ تصور نہیں کیا۔ چنانچہ اسی گشتی مراسلے میں بہ الفاظ واضح کہا گیا تھا:۔

"ہندوستان کی بہبودی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی بنیاد ڈالی جائے۔ اور باہمی مخالفت دور کرنے کی سعی کی جائے تاکہ دونوں قومیں باہم مل کر ملک کی خدمت انجام دیں اور مسلمان اپنے تئیں ہندوؤں کی حاصل کردہ سیاسی سطح کی بلندی تک پہنچ جائیں۔"

ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی تائید اور ہدایت تھی کہ

"اس غرض (ہندو مسلم اتحاد) کے لیے تمام غیر اختلافی مسائل میں مسلمان ہندوؤں کی تائید کرتے رہیں"

اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی اس روش سے انحراف نہیں کیا۔ مرکزی اسمبلی میں کانگریس نے حکومت کو جتنی شکستیں دیں وہ رہین منت تھیں۔ قائداعظم کے تعاون اور مسلم لیگ کی عالی ظرفی کی۔ سخت ترین اختلافی دور میں بھی، جب کانگریس اور لیگ دو متحارب قلعے بن چکے تھے، قائداعظم نے مشترک مسائل میں

ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دے کر حکومت کو شکست دی۔ حالانکہ اگر مسلم لیگ کانگریس کے خلاف ووٹ دیتی، یا غیر جانب دار رہ جاتی تو کانگریس کی شکست یقینی تھی، کیونکہ حکومت اور کانگریس کے ممبروں میں نقطۂ توازن مسلم لیگ پارٹی ہی تھی اور اس کا کئی مرتبہ اعتراف موتی لال نہرو اور بھولا بھائی ڈیسائی نے کیا۔

مسلم لیگ کا ایک انقلابی قدم

جہاں تک کریڈ (نصب العین) کا تعلق ہے مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں اس سلسلے میں بھی ایک زبردست انقلابی قدم اٹھایا۔ یعنی مناسب حال حکومت خود اختیاری کو اپنے نصب العین میں شامل کر لیا۔

مسلم لیگ کا یہ اقدام کتنا زبردست اور انقلابی تھا اس کا اندازہ مسٹر بھوپندر ناتھ باسو کی اس تجویز سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے کانگریس کے کھلے اجلاس میں پیش کی اور منظور ہوئی

وہ تجویز یہ تھی۔

"کانگریس کا یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے نصب العین دربارہ سلف گورنمنٹ کو تحسین کی نظر سے دیکھتا، اور جوش و خروش سے اس پر اظہار پسندیدگی کرتا ہے۔ کانگریس کو مسلم لیگ کے اس اعلان کے ساتھ پورا پورا اتفاق ہے کہ ملک کا سیاسی مستقبل یہاں بسنے والی مختلف قوموں اور ملتوں کے باہمی اتحاد و اتفاق پر منحصر ہے یہی کانگریس کا بھی بنیادی اصول رہا ہے۔!"

اگرچہ اس تجویز کی مخالفت بھی کی گئی اس لیے کہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے لیگ کو خراج تحسین پیش کرنا ایک حادثے سے کم نہ تھا، اسے کانگریس کے بلند خیال لیڈروں نے اپنے لیے باعث تذلیل بھی سمجھا کہ ایک "رجعت پسند جماعت

کو ایک حریت مآب جماعت کی طرح، نذر اخلاص پیش کی جائے، لیکن بہرحال یہ تجویز منظور ہوگئی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جائز حدود کے اندر مسلمانوں نے ہمیشہ کانگریس کی تائید کی، ہندو مسلم اتحاد کے لیے، اقلیت ہونے کے باوجود کسی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور غیر نزاعی امور کو "مشترک قومی مسائل" کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں گریز نہیں کیا۔

کانگریس کی ایک پرانی روش

اگر کانگریس نے شروع ہی سے پٹیل اور نہرو والی روش نہ اختیار کی ہوتی تو یقیناً بڑی آسانی سے تمام اختلافی مسائل طے پا سکتے تھے۔ اور ہندوستان کو کہیں زیادہ خوش گوار فضا میں، اور ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر آزادی کامل کا پروانہ مل گیا ہوتا۔

لیکن جس مرض میں کانگریس پہلے ہی دن سے مبتلا رہی اور جس میں اب تک مبتلا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنے "انا" کے سامنے کسی دوسرے کے وجود اور ہستی کو تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہوئی۔ دوسروں کے مطالبات جب بھی اس نے تسلیم کیے انتہائی برہمی، عتاب اور خفگی کے عالم میں، پاکستان کو اس نے خوشی سے نہیں قبول کیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب تک اس نے پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ آزادی سے قبل اس نے کیرالا، تامل ناڈ، گجرات، مہاراشٹر اور آندھرا کو مستقل صوبے تسلیم کر لیا تھا۔ کانگریس کے سالانہ جلسوں میں جو مندوب آتے تھے وہ ان تسلیم شدہ صوبوں سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد، اس نے اپنے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جب نوبت کشت و خون اور فتنہ و فساد تک پہنچی تب جا کر، اس نے ان صوبوں کو تسلیم کیا۔

تقسیم ہند کے وقت سکھوں کو سکھ اسٹیٹ کا سبز باغ اور خواب شیریں دکھانے

میں کانگریس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اس سے متاثر ہوکر، سکھ اپنے مقدس مقامات پاکستان میں چھوڑ کر پنجاب کی تقسیم پر رضامند ہو گئے لیکن آزادی ملنے کے فوراً بعد — وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا، سکھوں نے التجائیں کیں۔ خوشامدیں کیں پیمان وفا یاد دلائے، سب کچھ کیا۔ لیکن کانگریس سکھ اسٹیٹ یا پنجابی صوبہ بنانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئی، صاف واضح، اور غیر مبہم الفاظ میں اس نے اعلان کر دیا کہ اب کوئی صوبہ عالم وجود میں نہیں آسکتا لیکن جب سکھوں نے "یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید" کا نعرہ لگایا اور مرمٹنے پر تیار ہو گئے تو پنجابی صوبہ تسلیم کر لیا گیا،

ناگاؤں کو انگریزوں نے اسی طرح ہندوستان میں شریک کر رکھا تھا جس طرح برما، عدن، سیلون وغیرہ کو، ورنہ ناگالینڈ کبھی بھی، ہندوستان کا حصہ نہیں رہا تھا، قدرتاً آزادی کے بعد ناگاؤں نے حق خود ارادیت کا مطالبہ کیا جو حسب معمول رد کر دیا گیا۔ لیکن جب ناگاؤں نے اپنے آقاؤں کی زندگی اجیرن کر دی تو ان سے صلح و سلام کی گفتگو شروع کر دی گئی، پہلے ناگالینڈ کو ایک مستقل صوبے کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اب اس کی آزادی و خود مختاری زیر بحث ہے۔

میزو قبائل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

اور کشمیر کے سلسلے میں کانگریس نے جس ہٹ دھرمی، بے اصولی، اور وعدہ خلافی کا ثبوت دیا ہے وہ تو دنیا کی بڑی بڑی سامراجی حکومتوں کو بھی شرمندہ کر دینے کے لیے کافی ہے — ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے۔!

غرض ہندوستان کی پالیسی، اسی ایک حقیقت سے معمور ہے کہ اس نے جو کچھ چاہا صرف ہندوؤں ہی کے لیے چاہا، غیر ہندو مفاد کو اس نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اور مسلمانوں کے ساتھ جو اس دیس کی سب سے بڑی اقلیت

تھے ۔ اس کا برتاؤ ہمیشہ معاندانہ رہا ہے ۔ اگرچہ مسلمان ہمیشہ اس کی طرف دستِ صلح و تعاون بڑھاتے رہے ۔ اگر کانگریس میں یہ ہٹ دھرمی اور خود غرضی نہ ہوتی تو یقیناً ہندوستان تقسیم نہ ہوتا ۔ جیسا کہ کابینہ وفد کے زمانے ۱۹۴۶ء میں قائداعظم بھی اس پر بڑی حد تک رضامند ہو گئے تھے ۔

مسلمانانِ ہند اور عالمِ اسلامی

زیرِ بحث زمانہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ابتلا اور آزمائش کا زمانہ تھا۔

مسلمانوں کو ترکیہ کی حکومت اس لیے عزیز و محبوب تھی کہ یہ ملک خلافتِ اسلامیہ کا مستقر تھا۔ اس کے ناموس کے حفظ و دفاع پہ ہر مسلمان کا جان دے دینا مذہبی فریضہ تھا۔

ایران اس لیے عزیز تھا کہ یہ ملک اسلامی تہذیب، ثقافت، تمدن، علوم و فنون اور فکرِ اسلامی کی تشکیل و تخلیق کے سلسلے میں صدیوں تک ناقابلِ فراموش خدمت کر چکا تھا۔ اور اس کے آثار و نقوش، محسوس اور مرئی صورت میں اب تک موجود تھے۔ اور ذرا بھی زنگ خوردہ نہیں ہوئے تھے۔

حجاز اس لیے عزیز تھا کہ یہ سرزمین مہبطِ وحی تھی، کعبہ اگر خانۂ خدا تھا، تو مدینہ دیارِ رسولؐ تھا۔ اس سرزمین سے مسلمانوں کو والہانہ شیفتگی تھی، اور کسی قیمت وہ اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کی حرمت مجروح ہو۔!

اور قسمت کی خوبی دیکھیے یہ تینوں مقامات مورد آفات و محن بنے ہوئے تھے۔

ترکی کے خلاف سازش ترکی حکومت کے بارے میں در پردہ یہ

فیصلہ ہوچکا تھا کہ اسے زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ یورپین حکومتیں اپنے قلب میں ایک اسلامی حکومت اور ایک اسلامی مرکز کو ہرگز گوارا کرنے پر تیار نہیں تھیں۔

چنانچہ برطانیہ کی دسیسہ کاریاں، یونان کی غداریاں، اور ریاستہائے بلقان کی احسان فراموشیاں ایک سیل بلاخیز کی صورت میں ترکیہ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اس کے حصے بخرے کرکے اسے تباہ کردینے پر تلی ہوئی تھیں۔ ترکی حکومت کو ایک طرف نرغۂ اعداد سے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا، دوسری طرف داخلی طور پر غداروں، وطن دشمنوں اور دین فراموشوں کی جماعت تھی جو وفادار قوم نہ تھی اور اپنے ملک وقوم کے خلاف، دشمنوں سے ساز باز کررہی تھی۔ رتی رتی کی خبریں وہاں تک پہنچاتی تھی اور منہ مانگا انعام پاتی تھی،

ان دشمنوں کے ساتھ ساتھ ترکیہ کو ایک اور زبردست دشمن سے بھی سابقہ تھا۔ اٹلی کی حکومت، اپنے سامراجی مقاصد وعزائم کے ماتحت طرابلس الغرب (لیبیا) پر بھرپور وار کرچکی تھی۔ ترکی حکومت مصر کے راستے اس سفاکانہ اقدام کا منہ توڑ جواب دے سکتی تھی۔ لیکن شاہانہ اختیارات کے ساتھ برطانوی حکومت نے لارڈ کچنر کو مصر کا آمر مطلق بنا کر بھیج دیا تاکہ ایک ترک سپاہی مصر سے ہوکر طرابلس نہ جاسکے، یہ وہی کچنر ہے جو ہندوستان کا کمانڈر انچیف تھا اور جس نے مصر میں جاکر مہدی سوڈانی کی ہڈیاں قبر سے نکال کر اپنے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کیا تھا، اور جو پہلی جنگ عظیم میں غرق سمندر ہوا۔ ایک جرمن تارپیڈو نے اس کے جہاز پر حملہ کیا۔ حملہ اتنا کامیاب تھا کہ ہر طرح کی حفاظتی تدابیر کے باوجود نہ جہاز بچا نہ کچنر۔

اٹلی برطانیہ کی اس پشت پناہی سے بھی مطمئن نہیں تھا۔

وہ ترکی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا!

اور من مانے شرائط پر، ترکی حکومت سے صلح کرنا چاہتا تھا!

اور ترکی حکومت کو اس نے ٹائمز کی اطلاع کے مطابق متنبہ کر دیا تھا کہ اگر ترکی نے اٹلی سے صلح نہ کی یعنی طرابلس سے اطالیہ کے حق میں دست بردار نہیں ہوا تو پھر اٹلی کے طیارے خانہ کعبہ اور روضۂ نبوی پر (خاکم بدہن) بمباری کر کے انھیں مسمار کر دیں گے۔

اس خبر کے ساتھ اٹلی کا وہ انتباہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ یہ سال گزرنے کے بعد اٹلی جدّہ وغیرہ کی بندرگاہوں کا محاصرہ کرے گا اور وہاں آمد و رفت کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔

اٹلی یہ کر سکتا تھا،!

اس لیے کہ وہ خود بھی طاقتور تھا، اور اسے جو حلیف میسّر آئے تھے وہ بھی خود طاقت ور تھے، اس کے برعکس ترکی حکومت، سوائے صبر و شکر کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

داخلی خرابیوں نے اس کی قوت ختم کر دی تھی، وہ حکومت جو کبھی روس سے لڑتی تھی اور اس کے چھکّے چھڑا دیتی تھی، اب یونان کے سامنے بے بس تھی، جس کی فوجیں بڑھتی ہوئی ہنگری اور بوڈاپسٹ تک پہنچ گئی تھیں، اب بلغاریہ سے مقابلے کی تاب نہیں رکھتی تھیں، جنھوں نے رومن حکومت کے سب سے بڑے مرکز قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تھا۔ اب وہ ادرنہ (ایڈریانوپل) پر دشمن کو قابض ہوتے دیکھ رہی تھیں، جن کے نام سے کبھی یورپ لرزتا تھا اب انھیں یورپ کی ذرا ذرا سی بالشت بھر کی حکومتیں فتح کر دینے کی دھمکیاں دے رہی تھیں ــــ انقلابات ہیں زمانے کے۔

ترکی کے لیے کوئی بھی راہ نجات نہیں تھی۔

وہ مجبور تھا کہ دشمن کی دراز دستیوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرے

ایران کی داستان مظلومیت

ایران کا حال ترکیہ سے بھی بدتر تھا۔

یہ ملک بھی داخلی انتشار کا شکار تھا۔

روپیہ ناپید، سامان جنگ نایاب، فوج غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ، اور مقابلہ کس سے؟ دنیا کی بہت بڑی حکومتوں سے یعنی روس اور برطانیہ سے۔

روس نے ایران کے جن مقامات پر قبضہ کر لیا تھا وہاں

"ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو!!

زار کی حکومت نہ رحم کرنا جانتی تھی، نہ اقدار انسانی کے احترام سے واقف تھی، اس نے عوام و خواص کسی کو نہ چھوڑا۔ حد یہ ہے کہ علماء تک اس کے دست تطاول سے نہیں بچ سکے، زار شاہی حکومت کے مجموعہ تعزیرات میں سب سے معمولی سزا "پھانسی" کی تھی چنانچہ جن لوگوں کو برسر عام پھانسیاں دی گئیں۔ ان میں عوام، سیاستدان، حریت پرست، وطن دوست، اور آزادی خواہ تو تھے ہی، علمائے کرام کی بھی ایک جماعت تھی، حد یہ ہے کہ علامہ فقیہ الاسلام تک بے تامل پھانسی پر لٹکا دیے گئے جن کا سارا عالم اسلام احترام کرتا تھا۔

جو سلوک روس کی زار شاہی حکومت نے عام انسانوں کے ساتھ کیا تھا وہی عتبات عالیات کے ساتھ بھی کیا، چنانچہ مشہد مقدس پر زبردست بمباری کی، اس حادثے سے متاثر ہو کر عالم اسلام میں کہرام مچ گیا۔ اس لیے کہ یہ کوئی معمولی سانحہ نہ تھا، مگر روس کے زار پر، اور اس کی حکومت پر عالم اسلام کے اس ردعمل کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس کی توسیعی پالیسی اور سامراجی حکمت عملی برابر جاری رہی، روس کے علاوہ ایران، برطانیہ عظمیٰ کے لطف و کرم کا ہدف بھی بنا ہوا تھا۔

برطانیہ کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ وہ کمزور ملکوں اور قوموں کی مجبوری اور بے بسی سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے چنانچہ اس نے جب زار روس کی حکومت کو ایران پر قابض اور متصرف دیکھا تو خود بھی آگے بڑھا اور ایران کی حفاظت اور دوستی کے نام پر اپنے عساکر کا پڑاؤ وہاں ڈال دیا، برطانوی افواج کا

صدر مقام شیراز قرار پایا۔

مسلمانانِ ہند کا ایک خاص امتیاز

ہندوستان کے مسلمان اپنی حمیت دینی، غیرت قومی اور جوشِ ملی کے اعتبار سے ہمیشہ دوسرے اسلامی ملکوں سے ممتاز رہے ہیں، یہ جگر خراش اور زہرہ گداز مناظر دیکھ کر وہ کس طرح خاموش رہ سکتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے قدرت نے مسلمانانِ ہند کی بیداری کے اسباب تواتر اور تسلسل کے ساتھ پیدا کرنا شروع کر دیے تھے، ہر واقعہ جو ہندوستان سے باہر یا ہندوستان کے اندر رونما ہوتا تھا، ان کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوتا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ میدان عمل میں اترنے کی تیاری کرنے لگتے تھے۔

عالم اسلام کے یہ واقعات و حوادث بجائے جمود، سامان بیداری ثابت ہو رہے تھے، دوسری طرف خود ہندوستان میں پے بہ پے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جو ان کے دامن صبر کو تار تار کیے دے رہے تھے، تقسیم بنگال کی تنسیخ، مجوزہ مسلم یونی ورسٹی کے سلسلے میں نت نئے ناقابل قبول، اور قومی اعتبار سے تذلیل آمیز شرائط، ان سب نے مل کر مواد تیار کر دیا، خوبی قسمت سے قوم کی قیادت بھی جن نوجوانوں کے حصے میں آئی... خلوص، دیانت، اور جذبۂ قربانی سے بھرپور تھے۔ انھوں نے قوم کو پکارا اور قوم لبیک کہہ کر سامنے آگئی۔

سب سے پہلا اور اہم مرحلہ یہ تھا کہ ترکوں کی مالی اور ایرانیوں کی اخلاقی امداد کی جائے۔

ایران کی اخلاقی امداد مسلمانوں نے اس طرح کی کہ سارے ہندوستان کو ماتم کدہ بنا دیا، اور آخر مجبور ہو کر حکومت برطانیہ کی طرف سے وائسرائے کو یقین دہانی کرانی پڑی کہ برطانوی افواج شیراز سے جلد از جلد واپس بلالی جائیں گی۔

غلامی کے بدترین دور میں مسلمانان ہند کا یہ کارنامہ اس قابل ہے کہ آب زر سے لکھا جائے۔

ترکوں کی مالی امداد کے سلسلے میں بھی مسلمانوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں، محمد علی نے جو طبی وفد بھیجا تھا، اس سے متعلق مطلوبہ سرمایہ آن کی آن میں جمع ہوگیا۔

لیکن صرف اتنا کافی نہیں تھا

ترک ہر اعتبار سے خستہ و درماندہ تھے قدم قدم پر انھیں مال و زر کی احتیاج تھی۔ روپے کے بغیر نہ وہ فوجی تنظیم کر سکتے تھے نہ داخلی حالات سدھار سکتے تھے۔

اس معاملے میں غلام آباد ہند کے مسلمانوں نے ایک شاندار ریکارڈ قائم کر دیا۔ ہلال احمر کو لاکھوں روپیہ مسلمانوں نے دیا، وقت کے نوجوان زعیم اور کہن سال علما رمیدان میں آچکے تھے، انھوں نے اپنی تحریر و تقریر، شیوا بیانی، شعلہ نوائی، نغمہ آرائی، اور مرثیہ گوئی سے ایک سماں باندھ دیا، اس سلسلے میں محمد علی کے کامریڈ اور ہمدرد، ظفر علی خان کے زمیندار، ابوالکلام کے الہلال، اور شبلی کے نغمات نے تاریخ ساز فریضہ انجام دیا۔

اٹلی نے لگی لپٹی رکھے بغیر خانۂ کعبہ اور مدینۂ منورہ تک کو اپنی ترک تازیوں کی آماجگاہ بنا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مسلمانان ہند اس سے غافل نہیں رہ سکتے تھے۔

انجمن خدام کعبہ کا قیام

سب سے مقدم کام یہ تھا کہ حرمین شریفین، کو دشمنوں کے دست تطاول سے بچانے کے لیے سرفروش مسلمانوں کی ایک جماعت میدان میں اتر آئے۔

مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی صرف ایک پیر طریقت ہی نہیں تھے

ایک بلند پایہ عالم، ایک عظیم المرتبت خطیب اور ایک اونچے انسان بھی تھے، انھوں نے مسند درس و افتا چھوڑی، گوشۂ عزلت سے باہر نکلے اور سارے ہندوستان میں آگ لگادی، خوش قسمتی سے انھیں ایک ایسا دیوانۂ اسلام بھی میسّر آگیا تھا جو اسلام کی حرمت پر ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھا۔ جس نے اب تک عیش و تنعم کی زندگی بسر کی تھی، ہندوستان کا مانا ہوا کیریکٹر تھا، ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا، لیکن سرکاری منصب کو ٹھکرا کر یہ کھلنڈرا — شوکت علی — اس شان سے عرصۂ عمل میں نمودار ہوا کہ سب اس کی قوت، تنظیم، جوش کار، جذبۂ ملی، اور حمیت دینی کے قائل ہوگئے۔ "انجمن خدام کعبہ" کی تاسیس ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو بمقام دہلی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سربراہی اور مولانا شوکت علی کی معتمدی میں ہوئی، اس انجمن کی کارگزاری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نصف سال کی کم مدت میں اس کے ممبروں کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی۔

واضح رہے انجمن خدام کعبہ کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی، جس کی بنیاد ہنگامہ آرائیوں پر ہو، یہ ایک خالص ملّی تنظیم تھی اور ان لوگوں پر مشتمل تھی جو خدا کے نام پر اور رسولؐ کی حرمت پر کٹ مرنے کو تیار رہتے۔ ممبری کی شرط یہ تھی کہ حرمین شریفین کی تحریم اور ناموس پر قربان ہوجانے اور جان فدا کرنے کا فیصلہ کرکے ممبری کے فارم پر دستخط کیے جائیں۔

شوکت علی صاحب نے کامریڈ میں، الہلال میں، زمیندار میں۔ بعد کو ہمدرد میں مضامین اور مقالات کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ شروع کر دیا، یہ مضامین سادہ سی عبارت میں ہوتے تھے، لیکن ان میں جو روح کارفرما تھی وہ پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔

بہت جلد اس انجمن کی شاخیں ملک کے طول و عرض میں قائم ہوگئیں۔

ترکوں کی مالی امداد

ڈاکٹر انصاری کی سربراہی میں جو طبی وفد ترکیہ گیا تھا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں جولائی ۱۹۱۳ء میں واپس آ گیا تھا، طبی وفد کے بھیجنے اور اس کے واپس آ جانے کے بعد کام ختم نہیں ہو گیا۔ وفد کے آنے کے بعد بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ بہت سے نئے حالات کا پتا چلا۔

ان حالات کا خلاصہ اور ماحصل یہ تھا کہ اگر ترکوں کو زندہ رکھنا ہے تو بلا دریغ ان کی مالی امداد کرنی چاہیئے۔

اس زمانے میں بہت سی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومتیں قائم تھیں، ایسی مسلم حکومتیں بھی موجود تھیں جو اگرچہ "زیر سایۂ برطانیہ" زندگی بسر کر رہی تھیں لیکن ان کی آواز ایک طاقت رکھتی تھی اور اپنے حدود کے اندر رہ کر وہ بہت کچھ کر سکتی تھیں کم از کم ترکوں کی مالی اور مادی امداد تو بہ آسانی کر سکتی تھیں۔

لیکن یہ فریضہ کسی نے انجام نہیں دیا، یہ سعادت صرف اس غلام ملک کے غلام مسلمانوں کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی، کامریڈ اور ہمدرد کے صفحات ترکی تمسکات کو خریدنے کی ترغیب دینے کے لیے وقف تھے مضامین چھپتے تھے، نظمیں شائع کی جاتی تھیں، اداریے لکھے جاتے تھے، مشہور اور مقبول اہل قلم سے مقالات لکھوائے جاتے تھے غرض پوری تنظیم اور جوش و خروش کے ساتھ ترکوں کی مالی امداد کی اسکیم بروئے کار لائی جا رہی تھی۔ یہ کوششیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ رنگ لائیں اور بہت مختصر سی مدت میں لاکھوں روپے کے تمسکات فروخت ہو گئے۔

یہ ایک حقیقت تھی اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمانانِ ہند غلام تھے، اور غلاموں کو آقاؤں کی داخلی پالیسی میں تو کسی حد تک جنبش لب کی اجازت ہوتی بھی ہے، لیکن خارجی پالیسی کے سلسلے میں انھیں جنبش لب کی ذرا بھی

اجازت نہیں ہوتی ۔

برطانیہ نے جنگ طرابلس اور معرکۂ بلقان اور جنگ یونان وغیرہ کے سلسلے میں جو روش اختیار کر رکھی تھی، اس سے مسلمان حد درجہ مغموم و برہم تھے، اور وہ حکومت برطانیہ کے سامنے اپنے تاثرات پیش بھی کرتے تھے، لیکن ایوان حکومت سے صرف ایک ہی جواب ملتا تھا وہ یہ کہ خارجی معاملات و مسائل میں آپ کو بحث و گفتگو کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

اس حوصلہ شکن برتاؤ کے باوجود مسلمان برابر اور تواتر و تسلسل کے ساتھ برطانوی حکومت کے سامنے اپنے تاثرات پیش کرتے رہے اور اپنے سیاسی اجتماعات میں اس کی روش کے خلاف تجویزیں منظور کرتے رہے اور اپنی جیب کی آخری پائی بھی ترکوں کی امداد کے لیے ختم کر دینے کو تیار رہے ۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت اور پاکستان کی ۱۷ دن کی جنگ میں ایران اور ترکیہ کے خلوص اور محبت کی جو فصل ہم نے کاٹی ہے اس کے بیج ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں ڈالے گئے تھے ۔

سر ابراہیم رحمت اللہ، ہندوستان کے سیاست دانوں میں اپنے اعتدال، توازن، اصابت رائے، حب وطن، بے خوفی، جرأت اور استقامت کے اعتبار سے اس پائے کے شخص تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد تک نے الہلال میں انھیں خراج تحسین پیش کیا ۔ اور ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس بہ مقام آگرہ منعقد ہوا تھا ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر ابراہیم رحمت اللہ کے مدبرانہ خطبۂ صدارت کی بہت زیادہ تعریف کی تھی، سابق پنجاب اور سندھ کے گورنر، اور لیاقت علی کابینہ کے ممبر، مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ انہی کے صاحبزادے ہیں ۔

اپنے خطبۂ صدارت میں سر ابراہیم رحمت اللہ نے بہت سی کام کی باتیں کہیں ۔ انھوں نے صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا :-

"ہندوستان جیسا ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اجنبی حکومت کا غلام نہیں رہ سکتا۔ ہم مانتے ہیں برطانوی حکومت کی بنیاد رفاہ عامہ اور خدمت انسانیت پر ہے۔ پھر بھی اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ قیامت تک اس دیس پر حکومت کرے ہندوستان ہمارا آبائی ملک ہے اور ایک قابلِ صد ہزار فخر وراثت بھی، آخر وہ وقت آئے گا جب ہمارے آقا، اس ملک کی باگ ہمارے ہاتھ میں دینے پر مجبور ہوں گے!"

اسی خطبۂ صدارت میں، ہندو مسلم مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے صاحب موصوف نے ارشاد فرمایا:۔

"اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی نوع اور شکل کی بھی حکومت خود اختیاری اس دیس میں اس وقت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس ملک کی دو بڑی قومیں ۔ ہندو۔ مسلمان، آپس میں متحد نہ ہو جائیں۔ اور اس اتحاد کی بنیاد خلوص اور نیک نیتی پر نہ ہو۔ ان دونوں کے اتحاد کے بعد ہی ہم آگے قدم بڑھا سکیں گے، بغیر اس کے ہماری دقتیں اور مشکلیں رفع نہیں ہو سکتیں۔!"

انتخاب جداگانہ، کے سلسلے میں بھی صدر محترم نے اپنے بچے تلے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اور اس سلسلے میں جو خواہ مخواہ کا اختلاف ہندو اکثریت نے، اور جو زبردستی کی تلخی کانگریس نے پیدا کر رکھی تھی۔ اس کا بھی بڑا دل میں اتر جانے والا تجزیہ کیا فرمایا:۔

"ہم نے یہ چاہا کہ ملک کی خدمت کا بار ہم بھی اٹھائیں ہم نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی دوسری رعایا۔ ہندو اکثریت ۔ کو جو ذمے داری انصرام مملکت سے متعلق سونپی گئی ہے اور جو مواقع اسے دیئے گئے ہیں

ہمیں بھی دیے جائیں اور ہم بھی اپنی اہلیت ثابت کریں اور اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کریں، یہ وہ ذمے داریاں تھیں اور وہ حقوق تھے جن سے ہمارے بڑے بھائی - ہندو - ہماری کمزوری اور کم سنی کے باعث بہرہ یاب ہو رہے تھے -

آخر وہ وقت آیا کہ حکومت نے ہماری آرزو پوری کی. ہمارے مطالبات سنے، اور جس چیز کے ہم سزاوار تھے وہ ہمیں ملی - بجائے اس کے کہ ذمے داری کے معاملات میں ہمارے حصہ لینے سے، ہمارے بڑے بھائی خوش ہوتے - اور ہماری حوصلہ افزائی کرتے اس سے وہ خفا ہو گئے اور کچھ اس طرح سے خفا ہوئے کہ ان کی خفگی تاریخ کا ایک افسوس ناک حصہ بن گئی ہے! "

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد سر ابراہیم رحمت اللہ نے ایک بڑا چبھتا ہوا سوال کانگریس سے کیا -

"کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے اور مندوب، حکومت و ملک کے جوش اور جذبے میں کسی اعتبار سے بھی فروما یہ ثابت ہوئے ہیں؟ کیا جب کبھی بھی ملک کی صلاح و فلاح کا معاملہ زیر بحث آیا اور اس پر قانون ساز مجلس میں گفتگو ہوئی مسلمان نمائندوں نے دوسروں کی طرح خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ حصہ نہیں لیا - ؟ "

سر ابراہیم رحمت اللہ کے اس خطبۂ صدارت نے ہندوستان کے سیاست دانوں کو چونکا دیا - اور جو دوسروں کو خاطر میں کم لاتے تھے - اس کی تعریف و توصیف میں مجبور ہو گئے -

امر واقعہ یہ ہے کہ سرابراہیم، اور دوسرے لوگوں کے یہ خیالات ذاتی نہیں تھے۔ یہ وقت کی آواز تھی۔

اب مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش پیدا ہو چکا تھا اسے دبایا نہیں جا سکتا تھا۔

مسلمان تونگری اور محکومی کے جوہر سے آشنا ہو گئے تھے۔ اب ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کی جا سکتی تھی۔

وہ اپنے لیے اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بے لوثی اور بے رخی کے ساتھ، صداقت اور دیانت کے ساتھ مصروف تگ و تاز تھے، جس طرح ان کا دل اپنے زار و زبوں حال پر مضطرب تھا اس طرح، ترکیہ ایران اور دوسرے اسلامی ممالک کے لیے بھی وہ بے قرار رہتے تھے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو، مسلمان تھا۔ اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ دوسرے مسلمان کے غم اور مصیبت کو اپنا غم اور مصیبت سمجھے، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، ایران اور ترکیہ اور دوسرے مسلمانوں کے مصائب سے اور مظلومی سے متاثر نہ ہوتے۔

یہ تاثر اب نہاں خانۂ قلب سے نکل کر عملی صورت اختیار کر رہا تھا۔!

وہ جادۂ وفا سے منحرف ہونے لگے تھے۔

انگریز کی دہشت اب ان کے دل سے دور ہو چکی تھی۔

لرزہ خیز سامراجی مظالم کے تصور سے اب وہ لرزہ براندام نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان کا خیر مقدم کرتے اور انھیں برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔

بعد از غدر کچھ مدت تک وہ سہمے ہوئے رہے وہ اس کا تصور بھی نہیں

کر سکتے تھے کہ اتنی بڑی سامراجی حکومت سے پھر جائیں ۔

لیکن اب دنیا بدل چکی تھی ۔

زمین و آسمان بدل چکے تھے ۔

مسلمان بدل چکا تھا ،

اب تو وہ علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے تھے ۔

تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جائیں گے ۔!"

اور واقعی بہت جلد وہ وقت آ بھی گیا کہ انھوں نے بیک وقت تیغ اور توپ کی مار سہی ، اور حرف شکایت زبان سے نہیں نکالا ۔

انگریز بھی بڑے دانا اور ہوشیار ہیں ۔ آخر دنیا کے بڑے حصّے پر حکومت صرف فوج کے بل پر تو نہیں کر رہے تھے ، اس میں ان کے تدبّر ، معاملہ فہمی اور مآل اندیشی کا بھی بڑا حصّہ تھا ۔

اب وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مسلمانوں کے بارے میں جو توقعات انھوں نے قائم کیے تھے ، وہ تقسیم بنگال کی تنسیخ نے ختم کر دیے تھے ۔

وہ یہ بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی وفاداری سے متعلق انھوں نے جو امیدیں قائم کر رکھی تھیں وہ اب بار آور ثابت ہو رہی تھیں ۔

انھیں یہ احساس بھی تھا کہ اب مسلمان جاہل نہیں ہے ۔ نااہل نہیں ہے کند ذہن نہیں ہے ۔ اس نے انگلستان کی دانش گاہوں سے علم حاصل کیا ہے اور اپنی ذہانت کے بل پر مقابلے کے امتحان میں اپنے تناسب آبادی کے اعتبار سے زیادہ کامیاب رہتا ہے ۔

وہ اب اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمان مالی اعتبار سے تہی دست و بے نوا سہی ، سرکاری ملازمتوں سے محروم سہی ، سرکار کا معتوب سہی ، ملک کی ایک پسماندہ

اقلیت سہی، لیکن اب وہ انگڑائی لے کر اٹھ رہا ہے اور جب بھی وہ انگڑائی لے کر اٹھتا ہے تو کچھ نہ کچھ کر کے رہتا ہے۔

وہ اب خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔

- مسلم لیگ کے کریڈ (نصب العین) میں تبدیلی،
- مشترک مسائل میں سنگین ترین اختلاف کے باوجود کانگریس سے اشتراک و تعاون
- ترکیہ کا طبی وفد۔
- ترکی تمسکات کی عام فروخت۔
- انجمن خدام کعبہ کا قیام۔
- اقدام و عمل کی تیاری اور سروسامان۔

آخر یہ سب چیزیں کس امر کی غماز ہیں۔ کیا ان سے یہ حقیقت آشکار نہیں ہوئی کہ قلب مسلم کا اضطراب اسے ایک بالکل انوکھی چیز بنا تا جا رہا ہے، جو احتیاط طلب بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے خطرناک بھی۔

برطانوی پریس کی گھبراہٹ

چنانچہ ہندوستان کا وہ پریس، جو مسلمانوں کی ثنا خوانی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھا۔ اور کانگریس کے مقابلے میں انھیں برابر اکساتا رہتا تھا اور یہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اقلیت اور اکثریت کے مناقشات اس کی قوی حکومت کے استحکام و دوام کا سبب بن سکتے ہیں اور سلطنت انگلشیہ سے مسلمانوں کی وفاداری کو غیر متزلزل سمجھنے لگا تھا۔ اب اپنا زاویۂ نظر بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اگر اب یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گیا۔ "نیشنل ریویو" نے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے دکھ کے ساتھ کہا "ہندوستان کے مسلمان ایسے صلح پسند اور خاموش

نہیں ہیں جیسے اب سے چند سال پیشتر تھے ،، صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو دھمکی اور برطانوی حکومت کو صلاح بھی دی کہ :-

" مسلمانان ہند کے موجودہ رجحانات و تصورات کی یہ رو دیکھ کر برطانوی حکومت خاموش نہیں رہ سکتی "

لیکن یہ دھمکی بھی جب لکھنے والوں کو مطمئن نہ کر سکی تو اس نے مسلمانان ہند کے بدترین دشمن اور اسلام کے بدترین نکتہ چیں سر ولیم ہنٹر کی کتاب سے خطرناک قسم کے اقتباسات پیش کر کے حکومت برطانیہ کو ڈرایا .

" ہندوستان میں پھر انہی باغیانہ خیالات اور حکومت کے خلاف نفرت و معاندت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں جیسے اس زمانے میں تھے جب یہ کتاب لکھی گئی تھی ۔"

خلاصہ کلام یہ کہ مسلمانوں کی بیداری اور شعور ملّی سے انگریز سراسیمہ ہو گئے تھے اور ان کے مفکر و سیاست دان مضطرب نظر آ رہے تھے ، انھیں مستقبل قریب میں ہندوستان میں ایک ایسی قوم ابھرتی نظر آ رہی تھی جو اس قوت و طاقت سے ٹکر لینے کی ہمّت رکھتی تھی ، ہندوؤں سے وہ خائف نہ تھے اس لیے کہ انھیں خوش اور مطمئن کرنے کا گُر جانتے تھے اور زیادہ تر . . . . . یہ کہ ہندو کتنے ہی بم پھینکیں اور کتنا ہی بدیشی مال کا بائیکاٹ کریں ، مسلمانوں کی طرح خطرناک ثابت نہیں ہو سکتے ۔

اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ذہنی طور پر انھوں نے ہندوؤں کو اپنا ولی عہد تسلیم کر لیا تھا اور یہ طے کر چکے تھے کہ جب بھی اس دیس سے رخصت ہوں گے اپنے ملک کی جمہوریت کے مسلمہ اصول کے مطابق اکثریت کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ دیں گے اور رخصت ہو جائیں گے ، لیکن مسلمانوں کا معاملہ

بالکل دوسرا تھا وہ اقلیت میں تھے اور اقلیت بھی مستقل ۔ اس اقلیت کی بنیاد سیاسی نظریات پر نہ تھی، نہ معاشی اصولوں پر بلکہ دین و مذہب پر تھی۔ لہٰذا اکثریت اور اقلیت دونوں کو دوام حاصل تھا پر کیا کیا جائے، انگریز ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ پردۂ غیب سے ایک نیا طوفان نمودار ہوا ۔

اقبال اور ان کا عہد

گزشتہ باب میں جو مواد پیش کیا گیا ہے۔ اپنی اہمیت اور واقعات و حوادث کی کثرت کے باعث وہ مزید تفصیل کا طالب ہے۔

غدر کو نصف صدی کے قریب مدت گزر چکی ہے۔ جس نسل نے وہ ہولناکیاں بربادیاں اور تباہیاں دیکھی تھیں وہ عالم فانی سے عالم باقی میں پہنچ چکی تھیں۔ اور جو تھوڑے سے باقی رہ گئے تھے وہ لب گور تھے غدر کے لرزہ خیز حوادث اب فراموش ہو چکے تھے، اب نئی نسل میدان میں آ چکی تھی۔ یہ گزشتہ نسل کے مقابلے میں زیادہ جری تھی۔ طوفانوں اور خطروں کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا، اگر زندہ رہنا ہے تو خطرات سے دامن بچا کر زندہ نہیں رہا جا سکتا ہے۔ زندگی حاصل کرنے اور زندگی کو باقی رکھنے اور زندگی میں تابندگی و درخشانی پیدا کرنے کے لیے آتش نمرود میں کود پڑنا چاہیئے۔ اور بے خطر کود پڑنا چاہیئے، کوئی مضائقہ نہیں اگر ان زہرہ گداز خون آشامیوں سے پھر دو چار ہونا پڑے جن کا تجربہ ۱۸۵۷ء میں ہو چکا تھا۔ ایسے خطرات کا مقابلہ بار بار کرنا چاہیئے۔ تب ہی آن اور شان کے ساتھ زندگی قائم رکھی جا سکتی ہے۔

ایک نئے دور کی ابتدا

اس جذبے کو ترقی اور فروغ دینے کے اسباب خود حکومت برطانیہ مہیا کرتی گئی، ورنہ شاید مسلمان ابھی مزید کچھ عرصے تک نیازمندی اور سمع و طاعت کی زندگی بسر کرتے رہتے یہ حکومت کے — میں تو کہوں گا قدرت کے — پیدا کردہ اسباب ایسے تھے جنھوں نے مسلم ہندوستان میں بیداری، اضطراب، جوش، کردار اور جذبۂ قربانی کا فقید المثال اور نادر ولولہ پیدا کر دیا، دشمن مسلمانوں کی اس جہد حیات کو دیکھتے تھے۔ اور انگشت بدنداں رہ جاتے تھے، اور اگر کچھ کہتے تھے تو وہ بھی زیر لب، اور صرف اتنا کہ:

مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود!

جب کوئی نیا دور شروع ہوتا ہے تو اس دور کو فروغ دینے کے لیے قدرت کچھ ایسی شخصیتیں بھی پیدا کر دیتی ہے جو اس دور کے مطابق ہوتی ہیں، اس میں رنگ بھرتی ہیں اور اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔

غدر کے بعد جو دور شروع ہوا، اس میں سرسید، محسن الملک، وقار الملک، جسٹس محمود، سمیع اللہ بیگ، اور اسی طرح کے بزرگوں کی ضرورت تھی، انھوں نے وہ فرائض جو قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے انھیں سونپے تھے خوش اسلوبی سے انجام دیے

پھر جب وقت آیا، یا یوں کہیے کہ اس دور کی .... ضرورت نہ رہی تو یہ حضرات بھی دنیا سے رخصت ہو گئے، یا رخصت ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور یہ دور بھی ماضی کے دھندلکے میں رفتہ رفتہ تحلیل ہو گیا۔

اب نیا دور شروع ہوا، اس دور کو کامیاب بنانے کے لیے وقت اور عصر نے جن لوگوں کو آگے بڑھایا، اور قدرت نے پیدا کیا، وہ ہیں، محمد علی، ابوالکلام، اقبال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، شبلی اور چند دوسرے حضرات، اس دور کی

تاریخ اور واقعات و حوادث پر ایک نظر ڈال جایئے، صاف معلوم ہوگا کہ یہ دور انہی حضرات کا انتظار کر رہا تھا، جیسے ہی یہ نمودار ہوئے، اس نے اپنی کارفرمائی شروع کر دی، اب ہم اس دور کے چند خاص واقعات و حوادث کا تذکرہ کریں گے۔ اور ان حضرات کے ذہنی کارناموں کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

طرابلس پر اٹلی کا حملہ

سنہ ۱۹۱۱ء میں محض ہوس جوع الارض سے مجبور ہو کر اور یورپ کے "مرد بیمار" — ترک قوم — کی کمزوری اور ناچاری سے فائدہ اٹھا کر اٹلی کی سامراجی حکومت نے، طرابلس الغرب جو اب لیبیا کے نام سے ایک آزاد اور خود مختار حکومت ہے — پر حملہ کر دیا، طرابلس ترکی حکومت کا ایک حصہ اور خلیفۃ المسلمین کے ممالک محروسہ میں شامل تھا لیکن اطالیہ کو اپنے اس پڑوسی ملک پر سیاسی مصالح کے ماتحت قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اس نے بھرپور حملہ کیا، ترکی حکومت اتنی مجبور اور بے بس تھی کہ وہ "ترکی بہ ترکی" جواب دینے کی قدرت نہیں رکھتی تھی، اور اٹلی نے ناکہ بندی بھی ایسی کر رکھی تھی کہ ترک اسے توڑ کر طرابلس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

بے شک ترکی حکومت مجبور تھی۔ لیکن ترکوں کا جوش و جنون مجبور نہ تھا، ترکی فوج کے جیالے اور من چلے، سپاہی اور افسر، کسی نہ کسی ترکیب سے اٹلی کا حصار توڑ کر طرابلس میں داخل ہو جاتے تھے، اور ہر طرح کے وسائل سے محرومی کے باوجود اٹلی کی مستبد اور قاہر فوجوں کا مقابلہ کر کے اس کے دانت کھٹے کر رہے تھے، ترکی حکومت جب طرابلس کی کوئی مدد نہ کر سکی تو اس نے حسب معاہدہ طرابلس کو آزاد کر دیا۔ اب براہ راست اٹلی اور طرابلس کی جنگ تھی۔ ہاتھی اور بکری کی جنگ شیخ سنوسی جو روحانی پیشوا بھی تھے اور مجاہد کبیر بھی، اس جنگ کو جاری رکھے ہوئے تھے انور پاشا نے باب عالی میں اپنا استعفیٰ پیش کیا۔ اور کسی نہ کسی طرح سے طرابلس پہنچ

گئے، اور نئی مجاہد حکومت کی تشکیل کا بار اٹھانے کا اعلان کر دیا۔

ترک اگر مدافعت بھی کرتے تو اوّل فرنگ کی طرف سے ترکوں کی ترک تازیوں کے خلاف شور و شر کا ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ اور کوئی فرنگی حکومت کسی مسلم علاقے پر تاخت و تاراج کرتی، تو اس کی اخلاقی و مادّی امداد نہایت دریا دلی اور فیاضی کے ساتھ کی جاتی۔ طرابلس اور اٹلی کی جنگ میں بھی ایسا ہی ہوا۔

اقبال، نئے دور کا نقیب

مسلم ہندوستان میں طرابلس کی جنگ نے ایک نئی بیداری پیدا کر دی۔ ایک طرف مولانا محمد علی کی صحافت نے انگریزوں کے ایوان نمرودی میں تہلکہ مچا دیا۔ دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کے زور خطابت اور زور قلم نے مسلمانان ہند میں، مر مٹنے، اور فدا ہو جانے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور تیسری طرف شاعر وطن اقبال، شاعر اسلام بن گیا۔ اب تک وہ صرف وطن کا پجاری تھا۔ عظمت وطن کا نقیب!

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اور یہ وطن پرست شاعر عرب وطن کے جوش میں "نیا شوالہ" تعمیر کرنے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

نہ دین، نہ مذہب، نہ ملت، صرف وطن، یہ تھی اقبال کی شاعری، ۱۹۰۵ء تک

بلکہ اس کے کچھ بعد تک۔

اقبال کے خیالات میں تبدیلی

لیکن طرابلس کی جنگ نے، مغرب کی فریب کاریوں نے، مسلمانوں کی زبوں حالی اور تیرہ بختی نے، اسلام کی مساوات، اخوت اور رواداری نے، اسلام کی حیات آفرین تعلیمات نے وطن کے اس شاعر کو ملّت کا شاعر بنا دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء سے اس کی شاعری کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور وطن پرست شاعر جو خاک وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا سمجھ رہا ہے۔ اور جنگ و جدل کا موجب مسلمان کے خدا کو سمجھ رہا ہے۔ اور دیر و حرم سے ترک تعلق کر کے نیا شوالہ تعمیر کر رہا تھا۔ اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اب اس کا زاویۂ فکر حالات و حوادث نے یکسر بدل دیا تھا۔ وطن کے گیت گانے والے شاعر کی زبان پر اب یہ ترانہ تھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

سالار کارواں ہے میر حجازؐ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

یہ نیا گیت گاتے گاتے شاعر نے خود بھی محسوس کر لیا کہ جو نیا دور شروع ہو رہا ہے اس کا وہ نقیب خود ہے۔

اقبالؔ کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اور اپنے کارواں کو آگے بڑھا کر، وہ اسے یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یاد رکھو۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنائی روش لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

کہتے ہیں اور کس جوش سے کہتے ہیں کہ یہ وطن :۔

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نو کا ہے   غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے!
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے،
نظارۂ دیرینہ تو دنیا کو دکھا دے   اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

کیا کسی پجاری نے خود اپنے بنائے ہوئے شوالے کو، اس شان سے ڈھایا ہے، جس طرح اس برہمن " برہمن زادۂ امن آشنائے روم تبریزے۔! نے ڈھا کر دکھایا ہے ؟

وطنیت ایک ایسی تحریک تھی جس کی لپیٹ میں خود اقبال بھی آ گئے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کو جب وطنیت کا پرستار دیکھتے ہیں تو بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

اور پھر شاعر ملت، اپنی قوم کی نئی نسل کو خطاب کرتا ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے   وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں   کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے   کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے   جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی   کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اب شاعر کی نوا، نوائے جبریل بنتی جا رہی ہے۔ وہ وطنیت کا بت سر پہ۔

رکھ کر اٹھا تھا۔ مگر اب اس نے وہ بت چکنا چور کر ڈالا ہے۔ پہلے وہ اسلام سے اور اقدار اسلام سے بے گانہ تھا۔ اب وہ اپنی قوم کو جادۂ اسلام پر رہ روی کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ پہلے اس کے نزدیک سب کچھ وطن تھا۔ قومیت متحدہ تھی۔ اکثریت سے تعاون تھا۔ اب وہ اپنا دین اسلام کو بنا چکا ہے مصطفوی بن چکا ہے۔ ملی انفرادیت کا علمبردار ہے، اور اکثریت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور عین اس حالت میں کہ پیچ و تاب میں مبتلا ہے اسے ہلال عید نظر آجاتا ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

اور پھر اس کا نالۂ جانکاہ ہلال عید کے کانوں تک ان الفاظ میں پہنچتا ہے۔

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر!
اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ!
بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی بن
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو!!

اور جو بے آبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

چاند سے مخاطب ہو کر، اقبال نے ہندو اکثریت اور نیشنل کانگریس، انگریز قوم اور برطانوی سامراج، ملّت اسلامیہ اور اس کی زبوں حالی کا نہایت مکمل مرقع آنسوؤں کی روشنائی سے تیار کر دیا ہے۔

اور ٹھیک اس وقت جب مسلمانوں کو وہ اس طرح جھنجھوڑ رہا تھا، طرابلس کا حادثۂ حرب و ضرب پیش آیا۔ کوہ کا مقابلہ کاہ سے تھا، استعمار، پوری قہرمانیت کے ساتھ مظلوموں کو کچل رہا تھا۔ پامال کر رہا تھا۔ مسلمان خاک و خون میں مل رہے تھے۔ اور فرنگی قاتل انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، نہ بوڑھوں پر رحم کیا جاتا تھا، نہ بچوں پر، نہ جوانوں پر، نہ عورتوں پر، نہ بیماروں پر، لیکن حق و باطل کی یہ جنگ جاری تھی۔ باطل اپنے مہیب اور مرگ آفریں ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں ڈٹا ہوا تھا اور حق وسائل سے محرومی کے باوجود، گردنیں کٹا رہا تھا، مگر راہ استقلال و حریت سے انحراف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شاعر سپاہی نہیں تھا کہ تلوار لیتا اور طرابلس پہنچ جاتا، اور سپاہی ہوتا تو بھی، وہ ایک غلام ملک کا غلام باشندہ تھا۔ اپنی تلوار سے اپنی گردن کاٹ سکتا تھا۔ یا اپنے ہم مذہبوں کی، دشمن کے سینے اور حلقوم و گلو تک اس کی تلوار نہیں پہنچ سکتی تھی۔ آخر وہ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز — کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز!
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا — ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

شاعر اپنے رسولؐ کے دربار میں خالی ہاتھ نہیں گیا تھا۔ تحفہ لے کے گیا تھا

جواب میں عرض کرتا ہے۔

حضورِ دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — یہ چیز وہ ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

طرابلس کا معرکۂ حق و باطل کافی عرصے تک جاری رہا اسی دوران میں شاعر کو ایک ایسے واقعے کی خبر ملی، جس نے اس کے احساس میں طوفانی کیفیت پیدا کردی ۱۹۱۲ء میں ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ، دوران جنگ میں غازیوں کو پانی پلا رہی تھی کہ دشمن کا ایک گولہ آکر گرا اور وہ آن کی آن میں ختم ہوگئی۔ اس انسانیت سوز بربریت سے اقبال متاثر ہوا، اور اس کے تاثر نے اشعار کی صورت اختیار کر لی، اس نے کہا:۔

فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں ابھی خوابیدہ ہیں

پھر کہتا ہے اور کس تاثر اور لہجۂ جانگداز میں گویا ہوتا ہے، گویا الفاظ حلق سے نہیں دل سے نکل رہے ہیں:۔

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے — نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے